جیسا میں نے دیکھا

جی ایم سیّد

جیسا میں نے دیکھا

جی ایم سید

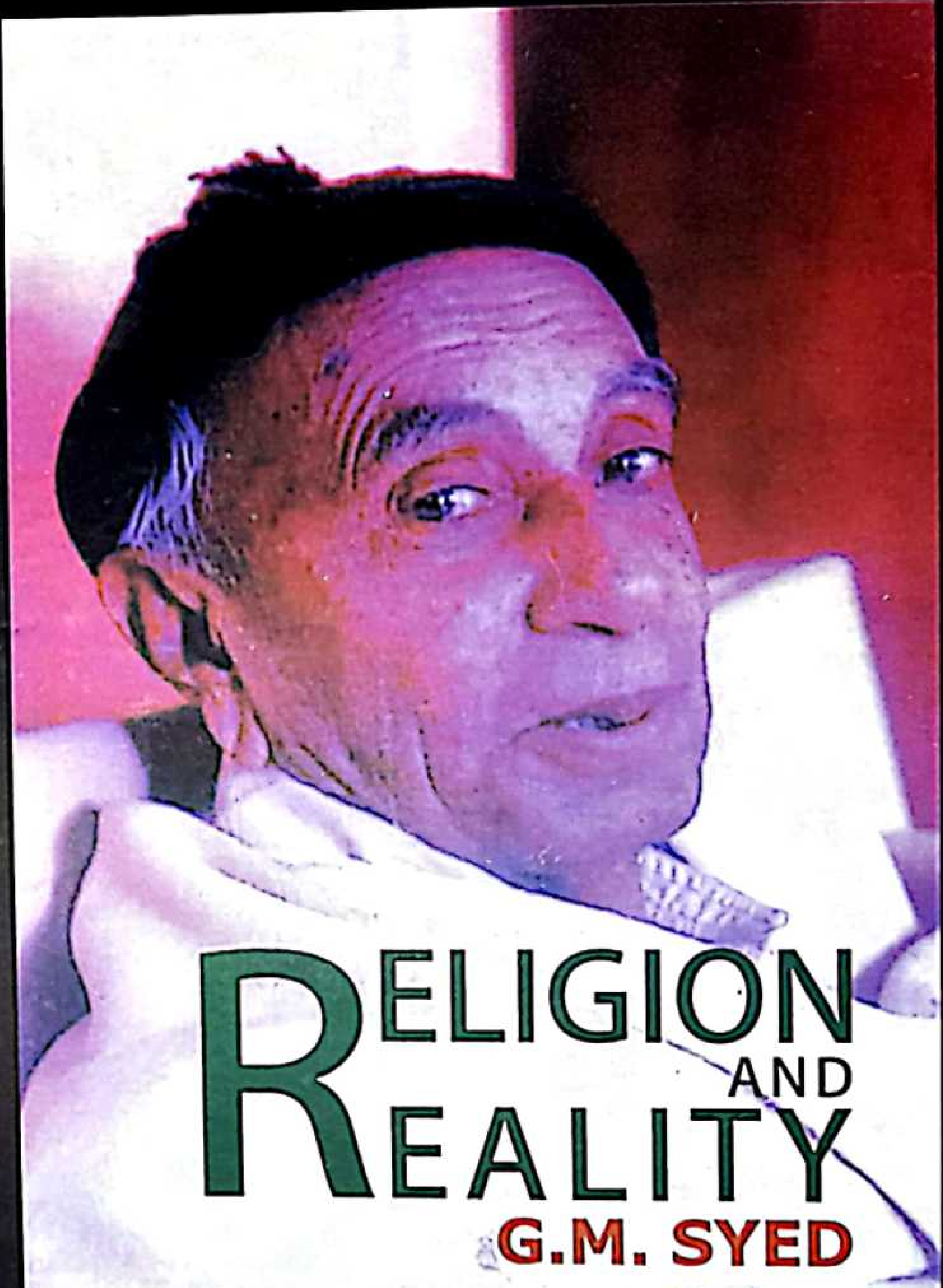

RELIGION AND REALITY

G.M. SYED

ISBN 978-969-562-189-9

فکشن ہاؤس

لاہور • حیدر آباد • کراچی •

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

جیسا میں نے دیکھا

جی۔ایم۔سیّد

فکشن ہاؤس
بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
Ph: 042- 37249218, 37237430
E-mail:fictionhouse2004@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	:	جیسا میں نے دیکھا
مصنف	:	جی۔ ایم۔ سید
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس لاہور
پرنٹرز	:	بک پیپر ہاؤس، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت اول	:	1972ء
اشاعت دوم	:	2012ء
قیمت	:	-/240 روپے

تقسیم کنندہ:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52،53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی

فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدرآباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

جيڏانهن ڪريان پرک، تيڏانهن صاحب سامهون
ڏسڻ جي ڏسين، ته هم ڪي حق چوين.

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

میں جس طرف بھی دیکھتا ہوں
جلوۂ حق بے حجاب پاتا ہوں
اور تم
اسے محدود قرار دیتے ہو
اگر تمہاری نگاہوں میں حقیقت شناسی کا جوہر پیدا ہو جائے تو
تم بھی اس کی آفاقیت کے قائل ہو جاؤ۔
کوئی شے تمہیں اس سے ماسوا نظر ہی نہ آئے گی

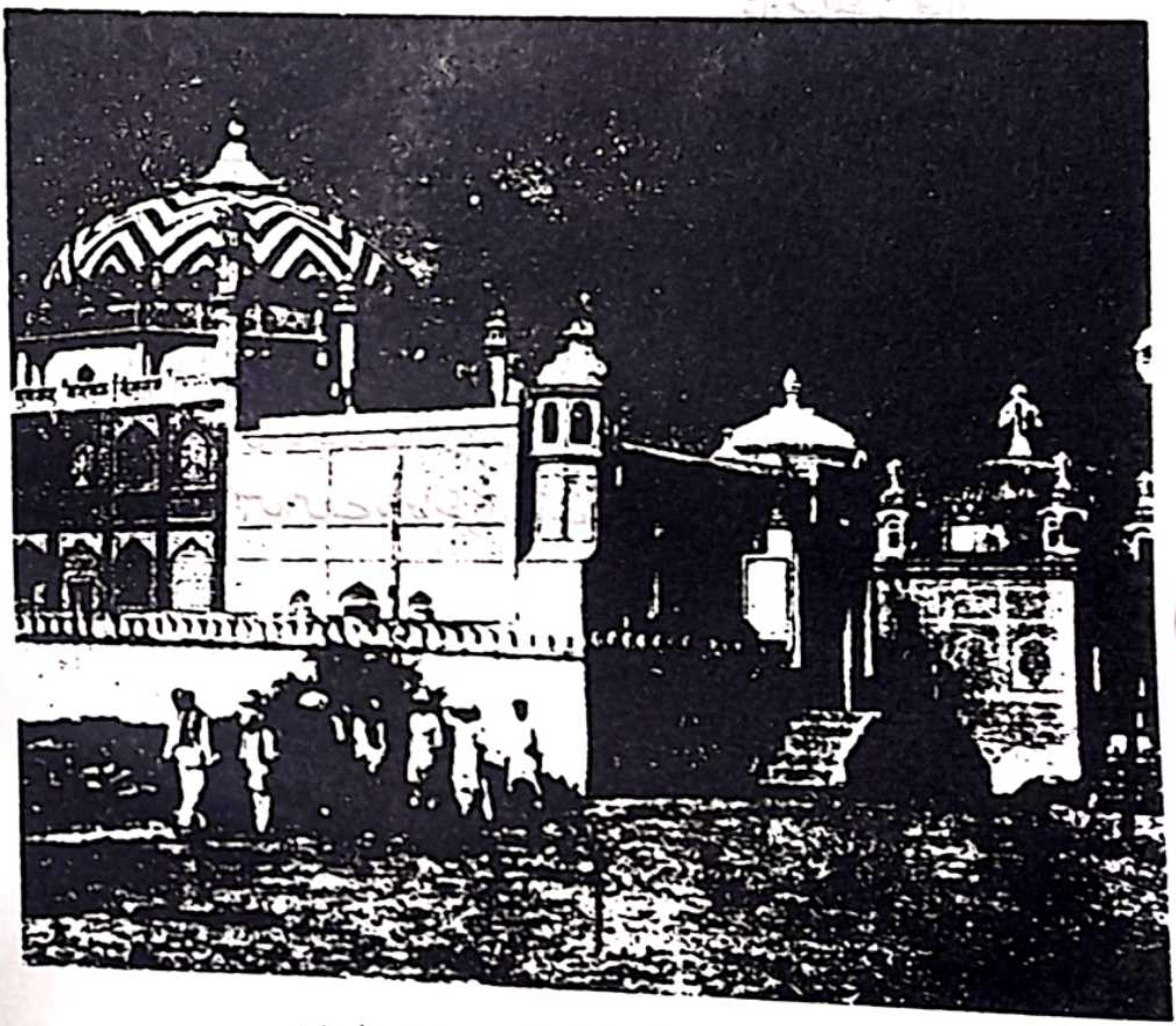

سر در قدمِ یار فدا شد چه بجا شد
این بارِ گران بود، ادا شد چه بجا شد
[شاه عنایت شهید]

اِنتساب

میں اپنی یہ کاوش سرزمینِ سندھ کے صوفیِ اعظم، ولیِ معظم، محرمِ رازِ ہست و بود، داعیِ فکرِ وحدت الوجود، مبلغِ وحدتِ ادیان و نقیبِ عظمتِ انسان، امامِ مشربِ لاکوفی حضرت شاہ عنایت اللہ صوفی یگانہ و وحید ملقب بہ شاہِ شہید کے نامِ نامی و اسمِ گرامی سے منسوب کرتا ہوں۔

جنھوں نے مذہبی تعصب کے خلاف جہاد میں یہ کہتے ہوئے سر قربان کر دیا ؎

سر در قدمِ یار فدا شد چہ بجا شد
این بارِ گران بود ادا شد چہ بجا شد

غلام مرتضیٰ سید

فہرست مضامین

☆ پیش لفظ 9

☆ باب اوّل

❖ مذاہب کا تاریخی پس منظر 17

☆ باب دوم

❖ مذاہب کے اجزائے ترکیبی 36

☆ باب سوم

❖ مذاہب کی کثرت اور وحدت 78

☆ باب چہارم

❖ اسلام کی دو تعبیریں 94

☆ باب پنجم

❖ تصوف جیسا کہ میں نے سمجھا 195

پیشِ لفظ

میں فطری طور پر ایک جذباتی آدمی ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مذہب سے مجھے شدید لگاؤ رہا ہے۔

ایک وقت تھا کہ میں روزہ نماز کی سختی سے پابندی کیا کرتا تھا۔ شب بیداری تہجد گزاری اور چِلّہ کشی کی ریاضتیں کرنا، بزرگوں کے مزارات پر حاضری دینا، درویشوں کی صحبت میں بیٹھنا، پیرانِ طریقت سے درس لینا، نذریں دلوانا، لوگوں کو زبردستی نمازیں پڑھانا، مسجدیں بنوانا، مذہبی وعظ کرنا وغیرہ وغیرہ میرے خاص مشاغل ہوا کرتے تھے۔

مذہب کے عام روایتی عقائد اور تعصبات میرے دل و دماغ پر ہر وقت چھائے رہتے تھے۔ ان کے مطابق زندگی گزارنے میں ہی میں اپنی اور کل بنی نوع انسان کی نجات سمجھتا تھا اور جو لوگ ان سے اتفاق نہ رکھتے تھے انھیں جہنمی اور قابلِ ملامت تصور کرتا تھا: لیکن پھر —— مختلف مذاہب کے لوگوں سے ملنے جلنے، ان سے بحث و مباحثہ کرنے، ان کے عقائد کی کتابوں کا مطالعہ کرنے اور ہر ایک پر غور و فکر کرنے کے باعث رفتہ رفتہ میرے مذہبی تعصبات کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ ان پر چُنی ہوئی نفرت و حقارت کی اینٹیں کھسکنے لگیں۔ اور تنگ نظری کی آہنی چار دیواری میں شگاف پڑنے لگے۔

اس تبدیلی اور اس کے اصل محرکات کا تفصیلی ذکر میں اپنی ایک تصنیف "اپنی کہانی اپنی زبانی" میں کر چکا ہوں، یہاں صرف یہ بیان کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ سر سید احمد خان کے مذہبی نظریات اور دیگر عقائد کے تفصیلی علم کے علاوہ میٹریلزم (مادّیت) تاریخ اور فلسفہ کے تجزیاتی مطالعے نے میرے ذہن و فکر میں خاص طور پر وسعت پیدا کی ـــــ اور آخر کار عشقِ مجازی کے مرحلوں نے میرے جذبات کے دھارے کا رُخ موڑ دیا۔

اپنی اس کیفیت کو آج سے پینتیس ۳۵ سال پہلے میں نے اپنے ایک مضمون "مجازی مرحلے" کے آخر میں یوں بیان کیا تھا:

"عشق نے مجھ پر جادو کر رکھا تھا۔ کثرت وحدت میں مرکوز ہو گئی تھی، پھر بھی کبھی کبھی اندر سے یہ آواز اُٹھا کرتی۔ یہ میری آخری منزل نہیں۔ رفتہ رفتہ صفاتِ بے ثباتی میں مجھے "لا اُحبُّ الآفلین" کا عرفان ہونے لگا۔ یہ دہ دور تھا جب نفسانی خواہشات کی اصلیت معلوم ہونے پر حصولِ تسکین کا ذوق سرد پڑنے لگا تھا۔ خون کی حرارت کم ہونے لگی تھی۔ جذبات میں ٹھہراؤ آچلا تھا۔ میں نے بصد ادب عشقِ مجازی کو سلام کیا۔ اب مجھے اس سے افضل سجدہ گاہ کی تلاش ہوئی۔

یہ مرحلہ بڑا تکلیف دہ تھا۔ پہلے حقیقت مجاز میں نظر آتی تھی۔ اور اس سے کچھ سکون ملتا تھا۔ مگر اب میدان خالی تھا۔ افضل مطلوب آنکھوں سے اوجھل تھا۔ کوئی بھی چیز صحیح نعم البدل کے طور پر لگا ہوں میں نہ جچتی۔ دل بے چین رہنے لگا۔ آخر رہبانیت اور ترکِ دنیا کی ٹھانی۔ ہر شے سے بے تعلق ہو کر یادِ الٰہی میں وقت گزارنے لگا۔ بیراگ نے دل پر ڈیرہ جمایا۔

ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت کے انہی ایام میں عشقِ مجازی کی ایک نئی صورت سامنے آئی۔ دل بے اختیار اس مطلوب کی طرف کھنچنے لگا۔ اس بار وہ فرد کے بجائے نظریہ کے روپ میں تھا۔ وحدت سے کثرت کی جانب۔

پہلے ماروی اپنے محبوب کھیت سی کے دردِ فراق میں مبتلا رہا کرتی تھی۔ اب اسے کھیت سی کی بجائے اپنے مارو (عزیز و ہم وطن) یاد آنے لگے۔ ماروی تھر کی باشندہ

تھی۔ اس کی محبت اپنے قبیلہ پر مرکوز ہوتی تھی۔ میرا وطن سندھ ہے میری محبت اپنے ہموطنوں کی جانب منتقل ہو گئی۔ یہ مجازی مرحلہ کا ارتقاء تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے۔ جوشِ عشق وہی رہا معشوق بدل گئے۔ نشہ وہی تھا۔ کیف بدل گیا۔ مے وہی تھی ساقی بدل گئے تھے۔

اس کے بعد میرے خیالات میں جو تبدیلیاں آئیں۔ ان کا اندازہ بزم صوفیائے سندھ میں میرے مختلف خطبات سے ہو سکتا ہے۔ موضع ڈٹرو میں منعقدہ کانفرنس کے موقع پر میں نے کہا تھا۔

"امنِ عالم اور انسانی رواداری کا احساس عام کئے بغیر بنی نوع انسان کی مادی و روحانی ترقی ممکن نہیں۔ یہ مطلوبہ فضا پیدا کرنے کی خاطر سرزمین سندھ ایک مثالی پیغام رکھتی ہے۔ آدمیت کا سچا فراخدلانہ احترام۔ ہمارے بزرگان کرام اور اولیائے عظام نے اسی کو اصلِ عبادت ٹھہرایا۔ اور ہمارے عوام صدیوں سے اسی پیغام کی سچائی اور کامیابی کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔"

یہ واقعہ ہے کہ مختلف عقاید اور تہذیبوں کی روادارانہ آماجگاہ کی حیثیت سے وادیٔ سندھ کو ہمیشہ سے ایک امتیازی یا منفرد خصوصیت حاصل رہی ہے۔ اس خصوصیت اور اس کے ماحصل کا بیان میں نے تفصیل کے ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی ۱۹۴۳ء میں اپنے استقبالیہ کمیٹی کے صدارتی خطبہ میں کیا تھا۔ یہاں اس کے کچھ اقتباسات پیش کرتا ہوں:

"دوستو! اس سرزمین کا ماضی نہایت تابناک رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کا مستقبل بھی ویسا ہی درخشاں ہوگا۔ متعدد اسباب کی بنا پر اس خطہ کی تاریخ شاندار رہی ہے۔ یہ سرزمین قدیم تہذیبوں کی جائے پیدائش ہے۔ موئن جو دڑو کے آثارِ قدیمہ اس دعوے کے گواہ ہیں۔ یہاں دنیا کی کئی قدیم نسلیں باہم مختلط ہوئیں۔ دراوڑ آریہ سامی اور منگول نسلوں کے نشانات یہاں آسانی سے مل سکتے ہیں۔ مختلف نسلوں کی طرح مختلف مذہبوں اور فلسفوں کا ملاپ بھی جیسا اس سرزمین

میں ہوا دوسری جگہ مشکل سے ہوا ہوگا۔

بدھ دھرم پیدا تو ہند میں ہوا مگر پھلا پھولا یہیں۔ اسلام جب اس سرزمین میں وارد ہوا تو بدھ دھرم ابھی یہاں رائج تھا۔ یہاں کے لوگ مہاتما گوتم کا نِروان (نجاتِ منفی) کا سبق نہیں بھولے تھے۔ اسلام نے بدھ کی تعلیم میں اثبات کا اضافہ کیا۔

ویدانت اور وحدانیت کے فلسفے اور اصول سب سے پہلے اسی سرزمین میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے۔

نظریۂ توحید نے اہلِ ہنود کی فکر پر اثر انداز ہو کر بت پرستی کے رجحانات کو کم کیا۔ اور بھجن اور کیرتن کی روحانی اور عوامی قبولیت سے متاثر ہو کر مسلم درویشوں نے غِنا کو جزوِ تصوّف بنایا۔ یوں ہندو اور مسلم عقاید اور افراد رواداری کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔ بھگت کبیر اور گرو نانک کی تعلیمات اسی رواداری اور میل جول کا نتیجہ اور ثبوت ہیں۔ وحدتِ مذاہب اور انسانی برادری کی ایکتا کی تبلیغ میں ہمارے یہاں شاہ عبداللطیف بھٹائی امتیازی مقام رکھتے ہیں یہ انہی کی موثر تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ وادئ سندھ میں رہنے بسنے والے ہر مذہب اور ہر عقیدے کے لوگ آپس میں انتہائی میل محبت سے رہتے ہیں۔ مذہبی یا فرقہ واری تعصب، چھوت چھات اور تشدّد کے رجحانات جتنے ہمارے یہاں معدوم اور بے اثر ہیں اتنے شاید ہی کہیں اور ہوں۔

اس سرزمین کی رفعتوں کا یہ ذکر میں نے اپنے معزز مہمانوں کے سامنے محض ان کا حافظہ تازہ کرنے کے لئے نہیں کیا ہے۔ میرا اصل مقصد اس سرزمین کے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے چند تجاویز پیش کرنا ہے۔

حضرات! یہ بات آپ سے پوشیدہ نہیں کہ نوعِ انسانی کی اجتماعی زندگی ارتقا کے مختلف مدارج طے کرتی ہوئی اپنی آخری منزل کی جانب بڑھ رہی ہے۔ اور یہ منزل۔ عالمگیر وحدتِ فکر و عمل ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ دنیا کے جملہ مذاہب، اخلاقی و فکری نظریوں اور سیاسی و اقتصادی عوامل اور تحریکوں نے اسی منزلِ مقصود

تک پہونچنے کے مختلف طریقوں یا راستوں کا کام دیا ہے۔ تاریخ کا ہر ورق اسی ارتقائی جدوجہد کا مظہر ہے۔ انہی راستوں پر گذرنے کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں الگ تھلگ رہنے والوں نے مل کر قبیلے بنائے اور مختلف قبیلوں نے مل کر قوموں اور ملکوں کو وجود بخشا۔

مختلف ادوار میں انسانی گروہوں کے مابین اتحاد کی مختلف قدریں رہی ہیں۔ بنیادی اور عمومی قدر کے طور پر زبان، معاشرت، عقاید اور مفادات کی یکسانیت کو امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔

دورِ حاضرہ کے جو نظریے محض فیشن کے طور پر پھیل رہے ہیں انھوں نے دنیا میں امن کو فروغ دینے کے بجائے فساد زیادہ پیدا کیا ہے۔ اس لیے کہ اتحاد کی جامع بنیادوں کو اہمیت دینے کے بجائے وہ صرف جزوی باتوں پر زور دیتے ہیں۔ بلا شبہ یہ جزوی قدریں ماضی کے ایک دور میں انسانوں کے بڑے بڑے گروہوں کے مابین وسیلۂ اشتراک رہی ہیں۔ لیکن بالآخر تاریخ کی کسوٹی نے انھیں کھوٹا سکہ قرار دے کر رد کر دیا۔

جب تک مختلف سیاسی، اقتصادی اور مذہبی عقاید کے تعصبات ختم کرنے کا کوئی ٹھوس حل نہیں طے کیا جاتا۔ دنیا میں دائمی امن و اتحاد قائم ہونا مشکل ہی رہے گا۔ اس حل کو پانے کے لیے خاص ماحول اور تاریخی روایات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ذہنی تربیت و صلاحیت سے استفادہ حاصل کرنا ایک لازمی شرط ہے۔ سرزمینِ سندھ کے باشندے اس امر کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہیں کہ انھیں اتحادِ انسانی کے سلسلہ میں ایک روشن مثال قرار دیا جائے۔ اور ان کے جذبۂ رواداری کی تقلید کی جائے۔

یہ محض آج کی بات نہیں کہ یہاں کے باشندے مذہب فرقہ اور سیاسی اختلاف کے باوجود آدمیت کا سچا فراخدلانہ احترام کرتے ہیں۔ یہ اس سرزمین کا صدیوں پرانا دستور ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں جتنی بھی

قوموں اور تہذیبیں یہاں آئیں باہم گھل مل گئیں۔ جتنے عقاید و نظریات یہاں جمع ہوئے ان کا بانا بھی تعصب، دوستی اور رواداری میں تبدیل ہو گیا۔

مجھے یقین ہے کہ ماضی و حال کی طرح اس سرزمین کی یہ خصوصیات مستقبل میں بھی نہ صرف باقی رہیں گی بلکہ ترقی کریں گی۔ زمانہ پر آشوب سہی مگر میں مایوس نہیں۔ مجھے امید ہے کہ دنیا کی تعمیر نو کی جدوجہد میں، جس کے نتیجے میں مشرق و مغرب کی موجودہ کشمکش بالآخر وحدتِ انسانی کے سانچے میں ڈھل جائے گی سرزمین سندھ کے پیغامِ محبت کو ایک خاص کردار ادا کرنا ہے۔"

یہ خیالات میں نے آج سے چھبیس برس پہلے ظاہر کیے تھے۔ جب سے سندھ کے پیغامِ محبت کے بارے میں میرا اعتقاد مضبوط تر ہوتا گیا ہے۔ اس پیغام کے علمی و فکری محرکات کیا ہیں؟ ہمارے اولیائے کرام نے اسے کس طرح ہمارے ذہن نشین کرایا؟ اپنی عمر کا بیشتر حصہ میں نے اس جستجو میں گزارا ہے۔ اس کتاب میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں وہ میری اسی طویل جستجو، تفکر، تحقیق اور تجربات کا نچوڑ ہے۔

میرے اخذ کردہ نتائج ایک جویائے حق کے "شخصی فیصلے" کہے جا سکتے ہیں۔ لوگوں کو حق ہے کہ وہ اپنے علم و تجربات کی روشنی میں ان سے اتفاق یا اختلاف کریں۔ میں حقیقت کی اجارہ داری کا دعویٰ نہیں کرتا۔ انسان سے غلطی ممکن ہے۔ ہاں۔ یہ ضرور عرض کروں گا کہ جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں ایمانداری کے ساتھ کر رہا ہوں۔ بحرِ حق بیشمار قطروں کا مجموعہ ہے۔ دنیا کا فکری و تمدنی باغ رنگ رنگ کے گلوں سے مزین ہے۔ میری یہ کاوش بھی شاید ان میں سے ایک ہو۔

مجھے اندازہ ہے کہ کٹر شریعت پرست حضرات میرے خیالات کو پسند نہ کریں گے۔ ممکن ہے ان میں سے بعض مجھے گمراہ یا اشتراکی کہنے لگیں۔ اس طرح شاید وہ نوجوان بھی میرے خیالات پر ناراض ہوں جو روایتی عقیدوں اور مذہبیت کے نام پر کیے جانے والے استحصال سے بیزار ہو کر میٹریلزم کی طرف جھکنے لگے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ مجھے رجعت پسند یا "صوفی ملّا" قرار دیں۔

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنی اس کتاب کی اشاعت سے میرا مقصد نہ دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانا ہے اور نہ ہی کسی کی دلآزاری کرنا ہے۔ میں نے اس میں جو کچھ بھی پیش کیا ہے وہ میرا تجزیاتی زاویۂ نگاہ ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص اس سے متفق ہو۔

من ہائے ہوئے میکنم کے بشنود یا نشنود

امید کہ "لکمُ دینکم ولی دینُ" (میرے لئے میرا دین تمہارے لئے تمہارا دین) کی قرآنی آیت پر ایمان رکھنے والے شریعت پرست حضرات اور آزادیٔ فکر و خیال پر اعتقاد رکھنے والے "ترقی پسند" حضرات میرے پیش کردہ خیالات کو فراخدلی سے برداشت کریں گے۔!!

میں سمجھتا ہوں کہ جملہ مذاہب، فلسفے، نظریات اور سائنسی علوم وغیرہ سب علمِ کُل یعنی بحرِ فیضِ الٰہی کے مختلف حصے ہیں۔ اس بحرِ بے کنار سے کسی کو ایک قطرہ بھی مل جائے تو وہ اپنی خوش بختی پر ناز کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی اس سے سیراب بھی ہوجائے تو بھی اسے صداقت کی اجارہ داری کے دعوے کا حق نہیں پہنچتا۔ بحرِ علم کل کسی کی ملکیت و میراث بننے سے بلند و برتر ہے۔ کوئی اس میں ناخدائی کرنے کا بھی مدعی نہیں ہو سکتا۔ خواجہ حافظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

در ہر طرف کہ رفتم جز حیرتم نیفزود
فریاد زیں بیاباں و زراہِ بے نہایت

عرفانِ حق مسلسل غور و فکر علم و تجربہ، تزکیۂ نفس اور تہذیب و عمل سے حاصل ہوتا ہے۔ میں نے بھی حسبِ استطاعت غوطہ زنی کرکے کچھ گوہر حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوہری انھیں سچے موتیوں میں شمار کریں یا جھوٹی کوڑیوں میں بہر حال "برگ سبز است تحفۂ درویش" کے مصداق اپنی دماغ سوزی کے نتائج جیسے ہیں ویسے ہی قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

قانونِ ارتقاء کے مطابق ہر دور میں نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ آئندہ بھی

یہ سلسلہ جاری ہی رہے گا۔ ایسی صورت میں کسی عقیدہ یا نظریئے کی شریعت یا دنیاوی ضابطوں کو حرف آخر قرار دینا دینِ فطرت (قانونِ ارتقار) کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ مجھے ہر مذہب میں حق کا پرتو نظر آیا ہے۔ سارے مذہبی نظریوں کو میں دینِ فطرت کا جز تسلیم کرتا ہوں۔ ان سب کے بنیادی مقاصد مجھے اتحادِ انسانی امنِ عالم اور ترقیٔ بنی آدم ہی معلوم ہوتے ہیں۔

میری نظر میں صاحبِ تصوف کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی خاص شریعت کا پابند ہو۔ وہ ہر مذہب، فلسفے اور سائنسی علوم و تجربات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ صوفی لاکونی (Non aligned) ہوتا ہے۔ اس کی محبت حدود و قیود سے بالا ہوتی ہے۔ وہ "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست" کا قائل ہوتا ہے۔

میں تصوّف کو صداقت و محبّت کا ایسا گلدستہ سمجھتا ہوں جس میں مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کے پھول سلیقہ سے آراستہ ہوتے ہیں۔ صوفی جملہ مذہبی عقیدوں فلسفوں اور علوم سے بنیادی وحدت وصداقت چن لیتا ہے۔ وہ خود کو کسی محدود دائرہ میں نظر بند نہیں رکھ سکتا۔ وہ حکیم ربانی " خذما صفا و دع ما کدر " (عمدہ بات جہاں سے ملے حاصل کرو اور خراب کو چھوڑ دو) پر صدقِ دل سے عمل کرتا ہے۔

صوفی کائنات کی خلقت میں منصوبہ اور مقصد دیکھتا ہے۔ اور ان کے علم و ادراک کو ہی مذہب کی روح تصوّر کرتا ہے۔ وہ ہر اس بات کو دینِ فطرت کے خلاف سمجھتا ہے۔ جو انسانوں کے مابین نفرت، عداوت، بدامنی، کمتری، برتری تشدّد اور نفسا نفسی پیدا کرتی ہے۔ ایسی ہر بات کے خلاف صدائے حق بلند کرنا صوفی کا نصب العین ہوتا ہے۔ راہِ تصوّف کے ایک ادنیٰ سالک کی حیثیت سے یہ کتاب میں اسی اعلیٰ نصب العین کے تحت پیش کر رہا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

غلام مرتضیٰ سیّد

بابِ اوّل

مذاہب کا تاریخی پس منظر

دنیا اور کائنات کے بارے میں مختلف علوم کے ذریعہ تاحال خاصی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ ان دریافتوں میں انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل اور مذاہب کی تاریخ بھی شامل ہے۔ جن علوم نے اوہام کے پردے ہٹا کر حقیقتوں کو ان کے اصل روپ میں پیش کیا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ جیالوجی (Geology) یا علم الارضیات۔ زمینوں کی ماہیت طبقوں اور تہوں کا علم۔

۲۔ جغرافیہ (Geography) زمین کے مختلف حصوں۔ آب و ہوا۔ سمندروں اور بیابانوں وغیرہ کا علم۔

۳۔ انتھراپالوجی (Anthropology) یا علم الانسان۔ انسانی زندگی کے ارتقائی درجوں کا علم۔

۴۔ ایتھنالوجی (Ethnology) یا علم نسل انسانی۔ انسانوں کی مختلف نسلوں کا علم۔

۵۔ فلالوجی (Philology) یا علم اللسان۔ مختلف زبانوں کی اصلیت اور ان کے تغیر و تبدل کا علم۔

۶۔ سوشیالوجی (Sociology) یا علمِ عمرانیات۔ انسانوں کی سماجی زندگی کے تغیرات کا علم۔

۷۔ آرکیالوجی (Archaeology) علمِ آثارِ قدیمہ۔ قدیم تہذیب کی دریافت کا علم۔

۸۔ فوک لور (Folk Lore) علمِ قدیم روایات۔ پرانے قصّے کہانیوں کا علم

۹۔ فوک کسٹمس (Folk Customs) علمِ قدیم رسم و رواج

۱۰۔ میتھالوجی (Mythology) علم الاصنام یا دیومالا۔ مذہبی قصّے کہانیوں کا علم۔

۱۱۔ فلاسفی (Philosophy) فلسفہ۔ عقلی دلائل کے ذریعہ کسی بات کی اصلیت متعین کرنے کا علم۔

۱۲۔ تاریخ (History) علم التاریخ۔ ماضی کی قوموں کے حالات و واقعات کا علم۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مذہب کی حقیقت جاننے کے لیے صرف الہامی کتابوں، تفسیروں اور روایات پر اکتفا کیا جائے۔ دورِ حاضرہ میں مذاہب کا علم بھی سائنس ہوگیا ہے ان محققین کی کاوش کو محض ہنس کے نہیں ٹالا جا سکتا جنھوں نے عمریں صرف کر کے مذکورہ بالا علوم کی مدد سے مختلف مذاہب اور ان کے مختلف شعبوں پر تحقیق کی ہے۔

مذہب پر ہونے والی یہ تحقیق دو قسموں میں تقسیم ہے۔

۱۔ مخصوص مذاہب کے خاص شعبوں کی تحقیق۔

۲۔ جملہ مذاہب کی تاریخ، ان کی پیدائش کے اسباب، ان کے اجزائے ترکیبی اور ان کے مقاصد کی تحقیق۔

پہلی قسم کی تحقیق کرنے والوں میں مفسر، محدث، فقیہ، آچاریہ، اور بشپ وغیرہ مختلف مذاہب و فرقہ کے علما شامل ہیں۔

دوسری قسم کی تحقیق کرنے والوں میں وحدت الوجودی صوفی، ویدانتی سنیاسی، مورخین، فلاسفر اور سائنسدان شامل ہیں۔

علما کے ان دونوں گروہوں کی علمی تحقیق اور اس کے ماحصل کو باریک بینی سے دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ پہلا گروہ مخصوص شعبوں میں اپنی عالمانہ بصیرت و مہارت کے باوجود کولہو کے بیل کی طرح ایک محدود دائرہ میں ہی گھومتا رہا ہے، اس کے مقابلہ میں دوسرے گروہ کی تگ و دو آفاقی اور لامحدود ہے۔

یہ دراصل اسی دوسرے گروہ کے مفکروں عالموں اور محققوں کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مذکورہ بالا علوم کی مدد سے مذاہب کی جامع تاریخ مرتب کی۔ ان کی پیدائش کے اسباب، بنیادی مقاصد اور اجزائے ترکیبی کھوج نکالے اور کثرتِ عقائد میں پائی جانے والی بنیادی وحدت تلاش کرکے اسے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

تاریخ مذاہب پر میں کوئی سندی مقالہ Thesis نہیں لکھ رہا ہوں کہ یہاں اس پر مفصل بحث کروں۔ میرا مقصد فی الحال صرف ان حقائق کا مختصر اظہار ہے جو مذاہب کی پیدائش اور ارتقا کی تاریخ کے علم سے میرے ذہن پر نقش ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ آگے چل کر مجھے جو کچھ کہنا ہے اس کا پس منظر واضح ہو جائے۔

سائنسدانوں کی تحقیقات کے مطابق کرۂ ارض پر زندگی کے آثار کروڑوں برسوں سے پائے جاتے ہیں۔ ابتدائی زندگی یا حیات ایک جرثومہ "آموبیا" کی شکل میں تھی۔ جس کے بعد مچھلیوں، رینگنے والے جانوروں، پرندے اور چوپایوں وغیرہ کے روپ میں ترقی کرتی ہوئی بالآخر انسان کی صورت میں نمودار ہوئی۔ یہ ارتقائے جسمانی حیات کا نقطۂ کمال ہے۔ انسان بجا طور پر اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہے۔ جسم و زندگی کے ارتقا کی طرح عقل و شعور کو بھی یہ سارے مراحل طے کرنے پڑے۔ جمادات نباتات اور حیوانات سے گزر کر انھوں نے بھی اشرف المخلوقات ہی کو اپنا مسکن بنایا۔

حضرتِ انسان کو وجود میں آئے کتنی مدت گزری۔؟ اس سوال پر تحقیقات کرتے ہوئے سائنسدان اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان لاکھوں برس سے اس دھرتی پر موجود ہے۔ سائنسدان اس بات کے بھی واضح ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ابتدائی دور کے انسان جنگلوں اور پہاڑوں میں دوسرے جانوروں کی طرح وحشیانہ زندگی گذارا کرتے تھے۔

انھیں جانور پالنے، کاشت کرنے، آگ سے فائدہ اُٹھانے، نیک و بد کا فرق کرنے حتیٰ کہ ستر پوشی کرنے کا بھی کوئی شعور نہ تھا۔ وہ ٹکڑیوں میں ہو کر ننگے پھرا کرتے تھے۔ درختوں کے پتے، جنگلی پھل، اور جانوروں اور مچھلیوں کا کچا گوشت ان کی غذا ہوتی تھی۔ رہنے کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا تھا۔ گرمی سردی سے بچنے کے لیے جانوروں کے غاروں اور کھوکھلے درختوں میں پناہ لیا کرتے تھے۔

وہ بات کرنا کب سے سیکھے؟ ان کی ابتدائی گفتگو کس قسم کی ہوا کرتی رہی؟ ان کی اخلاقی قدریں کیا تھیں؟ ان کے شعور کی پہونچ کن حدود تک تھی؟ یہ اور ایسے ہی دوسرے بہت سے سوالات پر اجمالی تحقیق ہو چکی ہے جس کے نتیجے میں بہت سی دلچسپ حیرت انگیز باتیں معلوم ہو چکی ہیں۔ تحقیقات کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ امید ہے کہ آگے چل کر تفصیل و ثبوت کے ساتھ اور بھی اہم معلومات حاصل ہوں گی۔

اب آپ ذرا مذاہب پر غور کریں۔ کیا موجودہ عالمی مذاہب میں سے کسی کی بھی عمر ساڑھے چار ہزار سال سے زیادہ ہے؟

کیا انھوں نے زندگی اور انسان کی ابتدار کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی ہیں؟

زمین اور کائنات کے بارے میں کچھ حقیقتیں بیان کی ہیں؟

کرۂ ارض اور اس کے باسیوں کے قدیم حالات اور واقعات پر روشنی ڈالی ہے؟

اگر ہاں۔ تو کیا وہ ساری یا ان میں کی بیشتر باتیں آج کی سائنسی تحقیقات اور جدید تاریخی معلومات کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں؟

علومِ حاضرہ ہمیں بتاتے ہیں کہ عہدِ قدیم کے انسان کو قدم قدم پر طرح طرح کے حوادث کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان میں سے بیشتر کے مقابلہ پر وہ خود کو قطعی بے بس پاتا تھا اور ان کے تصوّر سے ہی کانپ کانپ اُٹھتا تھا۔ بعض چیزوں کی دہشت تو ایک مستقل خوف کی حیثیت سے اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ مثلاً:-

آفاتِ سماوی:- یعنی شدّت کی گرمی سردی۔ سخت بارشیں۔ سیلاب۔ طوفان۔ زلزلہ۔ پہاڑوں کا پھٹنا اور آتشیں لاوا اگلنا وغیرہ وغیرہ۔

درندوں اور غیبی طاقتوں کا خوف: جنگلوں اور دریاؤں میں آئے دن انھیں شیر ہاتھی، گینڈے، ریچھ، اژدہے اور مگرمچھ جیسے خونخوار دشمنوں سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ اپنی ہر مصیبت اور ناکامی کا ذمہ دار وہ بعض نامعلوم اور پُراسرار غیبی طاقتوں کو قرار دینے لگے تھے، انھیں جن، دیو، بھوت اور شیطان وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے تھے۔ اور ان کے شر یا عذاب سے محفوظ رہنے کے جتن کے لئے پریشان رہا کرتے تھے۔

اتفاقیہ حادثے۔ مثلاً وبائی بیماریاں۔ زیادہ طاقتور گروہوں کے حملے، قحطِ غذا و آب۔ اچانک موت یا جسمانی معذوری۔ عورتوں اور وسائلِ حیات کے تحفظ و حصول کے جھگڑے وغیرہ۔

عہدِ قدیم کا انسان ان ساری افتادوں سے خود کو ہر وقت غیر محفوظ سمجھتا تھا۔ خوف اور ہراس اور واہمے ہر وقت اس کے سر پر منڈلاتے رہتے تھے۔

آخر کار اس کا ذہن ان عذابوں سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں لگ گیا۔ اس کے دو اہم مسائل تھے۔ تحفظ و بقائے جسم و جان اور تسکینِ روح و فکر۔ یہ دونوں مقاصد حاصل کرنے کے لئے اس نے سوچنا اور عمل کرنا شروع کر دیا۔

پہلے مقصد کے حصول کی جہد میں ہزاروں برس کے تجربات سے اسے کئی بہتر نتیجے حاصل ہوئے۔ مثلاً۔

دودھ اور گوشت حاصل کرنے کے لئے وہ جانور پالنے لگا تھا۔ اس سے ایک جانب معاش اس کے لئے آسان ہو گیا۔ دوسری جانب وہ شکار کی مشقت اور اس میں پیش آنے والے حادثات، اور خطرات سے بھی محفوظ ہو گیا۔

اسے چند خودرو پودوں کا اناج جمع کرنے کی عادت پڑ گئی۔ قحط سالی۔ پھل پتوں اور گوشت کی نایابی کے موقع پر وہ جمع شدہ اناج کو غذا کے طور پر استعمال کرنے لگا۔

اس نے لکڑی اور پتھر کے ہتھیار بنانا سیکھ لئے۔ اس سے درندوں کا مقابلہ اور شکار اس کے لئے پہلے سے زیادہ آسان ہو گیا۔

اسے آتش فشاں پہاڑوں اور جنگل کے درختوں کی رگڑ سے پیدا ہونے والی آگ کو محفوظ رکھا گیا۔ اور گوشت اور اناج پکانے، سردی کی شدت سے بچنے اور روشنی کے لیے وہ آگ کو استعمال کرنے لگا۔

ان سب باتوں نے عہدِ قدیم کے انسان کی زندگی کو پہلے سے زیادہ پرسکون بنا کر اس کی بہت سی مصیبتیں آسان کر دیں۔ اس کے ذہن و شعور پر چھائے ہوئے اندیشوں اور خوف کی گرفت نسبتاً ڈھیلی ہوئی۔ اس بات نے انسان کے دل میں معاشرتی انقلاب کی جانب پیش قدمیوں کی مزید جسارت پیدا کی۔ یہی جسارت آئندہ کی ایجاد کا پیش خیمہ اور بنیاد بنی۔ مادی ترقیوں کا قافلہ چل کھڑا ہوا۔

اپنے دوسرے اہم مقصد یعنی تسکینِ روح و فکر کے حصول کی کاوش میں بھی قدیم انسان نے پہلے سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ہزار ہا برس کے تجربات مشاہدات اور غور و فکر سے چند عقاید اور اوہام اس کے ذہن پر مسلط ہو گئے۔ ان میں سے خاص یہ ہیں:۔

دنیا کے ہر ذی حیات میں ایک روح، آتما یا جوہری توانائی ہوتی ہے جو مادی زندگی کے خاتمہ کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اس فکر نے ان میں حیات بعد ممات کا ایک مبہم تصور پیدا کیا، مضر یا مفید اشیاء کو وہ طاقتور روحیں سمجھنے لگے۔ اور بعض درختوں، پہاڑوں، عناصر اور اجرام فلکی کو ان سے منسوب کر کے ان کی پرستش کرنے لگے۔

بیشتر "طاقتور روحوں" کو وہ ظاہری طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ نہ ان کی حقیقت کا ادراک ہی ان کے بس میں تھا۔ تاہم بعض ظواہر Manifestations کی بنیاد پر وہ ان کے قائل ضرور تھے۔ سماوی آفتوں، اتفاقیہ حادثوں اور اپنی تمام مصیبتوں کا سبب وہ ان ارواح کی ناراضگی کو قرار دیتے تھے۔

مادی اور فکری ترقی کے اس ابتدائی دور میں بھی آدمی وحشی ہی تھا۔ ابھی محبت۔ رحم اور عفو کی صفات اس سے پرے تھیں۔ وحشیانہ زندگی کے عوامل نے اس کے ذہن میں یہ وہم بٹھا دیا تھا کہ جن ارواحِ غیبی کو وہ دیوی، دیوتا، درجن بھوت

کے ناموں سے یاد کرتا ہے۔ وہ سب خونخوار، جابر اور خطرناک ہیں۔ جو صرف خوشامد اور اظہار عجز (بندگی و پرستش) نذریں پیش کرنے، قربانیاں یا بلیدان دینے اور منتروں، ٹونوں، ٹوٹکوں اور جادو وغیرہ کے ذریعہ ہی راضی یا مہربان کیے جا سکتے ہیں۔ بس اسی فکر سے مختلف قسم کی عبادتوں اور پرستشوں وغیرہ کا آغاز ہوا۔

کہیں سورج چاند اور ستاروں کی پوجا ہونے لگی۔ کہیں دریاؤں، پہاڑوں سمندروں، بادلوں، درختوں اور آگ وغیرہ کو دیوتا قرار دیا گیا۔ اوران سب کی نظر عنایت حاصل کرنے کے عبادتی سلسلے شروع ہو گئے۔ بات بڑھتی رہی۔ ہوتے ہوتے وہ بعض مردہ جانوروں، عزیزوں اور دشمنوں کی روحوں کو بھی دنیاوی معاملات میں دخیل تصور کرنے لگے۔ ان کے "خیر و شر کے اثرات" کو اپنے مفاد کے مطابق ڈھالنے کے لیے انھوں نے مختلف اقسام کے وظیفوں، ریاضتوں، دعاؤں اور ٹوٹکوں وغیرہ کی بنا ڈالی۔ یہی نہیں تخلیق انسانی کے مادی اسباب پر غور و فکر کرتے کرتے وہ اعضا پرستی تک آپہونچے۔ جنسی خواہش کے دیوتا کام دیو اور کیوپڈ نیز لنگم Phallus وغیرہ کی پوجا اسی "عروجِ فکر" کی مظہر ہے۔

دیوتاؤں اور معبودوں کی تخلیق و پرستش کے اسی دور میں تجربات یا تصورات کے مطابق بعض جانوروں کو سعد یا نحس سمجھنے کی ابتدا ہوئی۔ جو جانور کسی قبیلہ کے لوگوں کیلئے مفید، معاون اور مبارک ثابت ہوئے وہ سعد ٹھہرے۔ ان کی توقیر و تکریم کی جانے لگی۔ انھیں دوست سمجھا جانے لگا۔ آگے چل کر ان جانوروں کو غیبی طاقت کا مظہر تصور کیا جانے لگا اور دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا شروع کر دی گئی۔ اسی طرح جو جانور مضر، پریشان کن اور نامبارک محسوس ہوئے انھیں نحس قرار دیا گیا۔ وہ گندی روحوں کے مظہر اور دوست ٹھہرے۔ اور ان سے نفرت و احتراز برتا جانے لگا۔ علم الانسان کی کتابوں میں ایسے سعد جانوروں کو ٹوٹم Totem اور نحس جانوروں کو ٹابو Taboo کہا

گیا ہے۔ گائے، بندر، کتا اور سور وغیرہ ایسے ہی ٹوٹم یا ٹابو ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر انسانی قبیلہ یا گروہ نے ٹوٹم اور ٹابو کا اپنے اپنے طور پر انتخاب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قبائل میں سعد یا نحس سمجھے جانے والے جانور دیگر قبائل میں دونوں میں سے کچھ بھی نہ سمجھے گئے۔ یا پھر ایک قبیلہ کا ٹوٹم دوسرے قبیلہ کے لوگوں کا ٹابو شمار ہوا۔

سبب ظاہر ہے۔ ہر انسانی گروہ کے حالات، تجربات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

جانور پسندی یا جانور پرستی کی ریت بڑھی تو نوبت یہاں تک جا پہونچی کہ لاتعداد قبائل دوسروں پر اپنی برتری کا سکہ جمانے کے لئے اپنا سلسلۂ نسب مقبول جانوروں سے ملانے لگے۔ مثلاً:

کیلیفورنیا کے ریڈ انڈین خود کو بھیڑیوں کی اولاد بتاتے ہیں۔ تاتار کے بعض ترکوں اور منگولوں کے ممتاز قبائل دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان کی وہ ماں جس سے ان کی نسل شروع ہوئی نیلی آنکھوں والی مادہ گرگ تھی۔ امریکہ کے قدیم باشندوں کے بعض قبائل مختلف پرندوں، چوپایوں اور مچھلیوں کو اپنا مورثِ اعلیٰ قرار دیتے ہیں اور آج تک ان ہی کے ناموں سے موسوم ہیں۔ افریقہ کا مشہور قبیلہ ویٹیکا اپنے آپ کو لکڑ بگھے کی اولاد ظاہر کرتا ہے۔ ملایا کے بعض قدیم باشندے خود کو ایک بڑے لیمور (لنگور) کی نسل قرار دیتے ہیں۔ نیو گنی کے باشندے دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مچھلی اور سفید طوطے کی اولاد ہیں۔ حجاز کے مشہور قبیلے بنو اسد اور سندھ کے قبیلہ کہتر کی وجہ تسمیہ جو بھی کچھ ہو بہر حال یہ دونوں قبیلے بھی ہیں شیر ہی کے نام سے موسوم۔

یہ تو ہوئی جانوروں سے شجرۂ نسب ملانے کی بات اور آجکل اس بات کی قدر اتنی نہیں رہی۔ پھر بھی پسندیدہ جانوروں کے نام پر افراد کے نام رکھنے کی رسم اب تک چلی آ رہی ہے۔ یہی نہیں متعدد مہذب اقوام آج بھی اپنے اپنے ٹوٹم جانوروں کو فخریہ اپنے قومی نشان کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ مثلاً روس کا ریچھ چین کا اژدہا۔

جرمنی اور امریکہ کا دو سروں والا عقاب۔ برطانیہ کا دو منہا شیر وغیرہ وغیرہ۔ جانوروں کو سعد و نحس سمجھنے کے تصور نے آگے چل کر ستاروں اور سیاروں کو مبارک و منحوس قرار دینے کی فکر تک پرواز کی۔ یہ اڑان اس کے بعد بھی جاری رہی یہاں تک کہ آخر کار اس فکر نے نیک و بد۔ خیر و شر اور حق و باطل کو دو عظیم غیبی طاقتوں کی کشمکش سے منسوب کر دیا۔ راکشش و دیوتا۔ اہرمن و اہرمزد اور شیطان و ملائکہ کے تصورات اسی تعمیم کاری یا تقسیم صفات کا مظہر ہیں۔

گویا یہ تھی انسانی شعور یا ذہنی بے چینی کی وہ اعلیٰ منزل جہاں ارتقائے جسم کے ہزاروں اور لاکھوں سال بعد انسان تسکینِ روح و فکر کے حصول کی جدوجہد میں پہنچا۔

انسان کے شعور میں آگے بڑھنے کا تحرک کیوں پیدا ہوا؟ وہ ذہنی بے چینی میں کیوں مبتلا ہوا؟ اس کی روح اور فکر میں حصول تسکین کی تڑپ کیوں پیدا ہوئی؟ کیا فکر و تجسس کی یہ لگن محض اضافی حیثیت رکھتی ہے؟ کیا انسانی ضمیر اپنا منتہائے مقصود اب تک نہیں پا سکا؟ اگر نہیں تو کیا وہ کبھی اپنی منزل پا سکتا ہے؟

یہ سب اس موضوع پر انتہائی اہم سوالات ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ آسان اور ہر شخص کی سمجھ میں آجانے والا آخری سے پہلے والے سوال کا جواب ہے۔ یعنی انسانی روح و فکر تا حال بے چین ہے۔ تسکینِ خاطر و ضمیر کی تڑپ آج بھی اولادِ آدم کے دل سے دھواں بن کر بلند ہو رہی ہے۔ باشعور انسان کا حال آج بھی جگر مرحوم کے اس شعر کے عین مطابق ہے

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے
بیٹھے ہم انتظارِ سحر دیکھتے رہے

تاریک اور روشن دونوں ہی پہلو میرے سامنے ہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ سورج نکلے ہیں مگر یہ بھی غلط نہیں کہ بجا طور پر انتظارِ سحر بھی ختم نہیں ہوا۔ بات صرف یہ ہے کہ اب تک جتنے آفتاب ابھرے ان کی روشنی کسی نہ کسی دائرہ تک ہی محدود رہی۔ بے شک ان کی کرنوں سے کچھ دیئے اور شمعیں بھی جلائی گئیں۔ مگر پھر تاریکی دور کرنے کے بجائے ان سے گھروں اور بستیوں کو جلانے کا ہی کام لیا گیا۔ ہاں گھر اور بستیوں کے جلنے سے بھی کچھ روشنی پھیلتی ہے ——

لیکن اگر تاریکی دور کرنے کا یہی صحیح حل تھا۔ تو یہ سب کچھ ہو چکنے کے باوجود آج یہ ہر سو
گھپ اندھیارے کیوں بڑھ رہے ہیں؟ بے چینی، منافرت، اشتعال اور تشدد کا جنون
کیوں ترقی کر رہا ہے؟ ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کے وحشیانہ مقابلے کیوں ہو رہے ہیں؟
لاریب۔ زمانہ پر صرف گھور اندھیروں ہی کا تسلط نہیں۔ ایک نورانی نظریہ و عقیدہ
کی چمک دمک بھی ظلمات کے پردے چاک کرتی رہتی ہے۔ اسی نظریہ کی تب و تاب بڑھانا
اہلِ درد و شعور کا مقصود ہے۔ ساری نیک امیدیں اسی سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔
مگر وہ عقیدہ ہے کون سا؟ اس کے جواب میں طرح طرح کی بولیاں آپ کو سنائی دیں گی۔
بلند بانگ دعوے آپ کے سامنے پیش کئے جائینگے درجنوں نئے اور پرانے عقاید
کے علمبردار آپ کو اپنی طرف گھسیٹنے لگیں گے۔ یہ صورتِ حال خاصی چکرا دینے والی ہوتی
ہے۔ عقل تذبذب میں پڑ جاتی ہے کہ کسے قبول کرے اور کسے رد کرے۔ پھر بھی صحیح
انتخاب کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ کسوٹی یہ ہے کہ جس نظریہ و عقیدہ کے داعی بھی مسحور کن
لن ترانیوں کے بعد مخالف یا دوسرے عقاید و نظریات کے خلاف نفرت و اشتعال کی
تلقین کرنے لگیں۔ جذباتی اختلاف کو بنیاد بنا کر تعصب اور تنگ نظری کو ہوا دینے لگیں۔
ملک اور دنیا میں اپنے عقیدہ کا "نورانی عمل" پیش کرنے کے لیے ملکی بین الاقوامی
اور عالمگیر اقتدار و تصرف کو ضروری قرار دینے لگیں۔ سمجھیے وہ کھوٹے سکے ہیں! ایسا
عقیدہ کبھی روحانی پیغام تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کھرا سکہ یا بنی آدم کی تسکین کا باعث صرف
وہ پیغام ہو سکتا ہے۔ جو نسل و رنگ دین و مذہب اور خیال و عقیدہ کے تعصبات سے
بالکل پاک ہو۔ جو آدمی کو آدمیت کے جذبۂ احترام کے ساتھ مخاطب کرے جو انسان
اور اس کے معاملات و مسائل کو صرف انسانیت کی نگاہ سے دیکھے۔ یہ سچا پیغام
محبت، رواداری اور مساوات کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اس کے معاملات و مسائل
کو صرف انسانیت کی نگاہ سے دیکھے۔ یہ سچا پیغام محبت، رواداری اور مساوات کے علاوہ
کچھ نہیں ہو سکتا اس اعلیٰ و ارفع پیغام کو پھیلانے اور عام کرنے کے
نہ کسی طاقت و اقتدار کی ضرورت ہے اور نہ ہی جبر و تشدد کی منافرت، تعصب اور
تنگ نظری اس پیغام کی اضداد ہیں۔ یہ اضداد کسی بھی بہانے کسی بھی نوعیت سے اس

پیغام میں شامل ہو جائیں تو اس کی شیرینی اور حلاوت زہر ہلاہل کی تلخی میں بدل جاتی ہے۔ مٹھاس کا کوئی متلاشی اسے ہاتھ نہ لگائے گا۔ اور جو سادہ لوح اسے پی لے گا تلخی کے سوا اس سے کچھ نہ ظاہر ہو گا۔

میں اور میری طرح محبت، رواداری اور مساوات پر اعتقاد رکھنے والے دنیا کے دوسرے بہت سارے آدمیت دوست افراد اس بات سے مایوس نہیں ہیں کہ ایک دن دنیا میں انسانیت کا بول بالا ہو گا۔ انسان کی ازلی بے چین روح اپنا مطمحِ نظر پا لے گی اور اسے سکون مل جائے گا۔ یہ اعتقاد یقین یا امید محض خواہشِ نیک کی بنیاد پر نہیں بلکہ ٹھوس حقیقتوں کی بنیاد پر ہے۔ یہ ٹھوس حقیقت یہ ہے کہ پیغامِ محبت کی عمومیت کی خواہش انسانی زندگی کے لیے اضافی نہیں لازمی حیثیت رکھتی ہے انسان کی روح و فکر اس تسکین کو حاصل کرنے کے لیے ماضی میں سخت بے چین رہی ہے۔ آج بھی ہے اور اس وقت تک بے چین ہی رہے گی جب تک کہ اسے پا نہ لے گی اس راہ کی اصل رکاوٹ وحشیانہ جذبات ہیں۔ تہذیب و شائستگی کے فروغ سے انھیں ختم کیا جا سکتا ہے۔ انسانی رواداری یا احترام تہذیب و شائستگی کی شرطِ اول ہے۔ یہ شرط ہم اپنی حیوانی جبلتوں کو لگام دے کر پوری کر سکتے ہیں۔

اب رہ جاتے ہیں یہ سوالات کہ۔ انسان کے شعور میں آگے بڑھنے کا تحرک کیوں پیدا ہوا؟ اسے ذہنی بے چینی کیوں لاحق ہوئی؟ اس کی روح و فکر میں حصولِ تسکین کی تڑپ کیوں پیدا ہوئی؟

ان سب کا ایک ہی صحیح اور قابلِ فہم جواب ہے۔ "تجرباتِ زندگی"۔ انسانی فکر و شعور کے جملہ مدارج دراصل زندگی میں ہونے والے، اچھے یا برے تجربات ہی کی پیداوار ہیں۔ یہ تجربات نتیجہ ہوتے ہیں حیوانی جبلتوں Instincts کے عمل و ردِ عمل کا۔ زندگی کی ساری تاریخ دراصل انہی جبلتوں کی وحشت و تہذیب کی کشمکش کی تاریخ ہے۔

مندرجہ ذیل جبلتیں اس سلسلہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۔ Instinct of acquisition اشیاء کے حصول کی جبلت۔

۲۔ Instinct of Race Preservation نسل قائم رکھنے کی جبلّت
۳۔ Instinct of Self Preservation تحفظِ ذات کی جبلت
۴۔ Instinct of Repulsion نفرت کی جبلّت
۵۔ Instinct of Elation or Self display خود نمائی کی جبلّت
۶۔ Instinct of Pugnacity or Self assertion تشدّد کی جبلّت

ان میں سے ہر ایک نے انسانی زندگی میں کیا کردار انجام دیا اس کا مختصر ذکر بے محل نہ ہوگا۔

۱۔ اشیاء کے حصول کی جبلت۔ اس جبلت کے تحت ضرورت اور آسائش کی چیزیں حاصل کرنے کیلئے آدمی کو جو جتن کرنا پڑے اس سے افراد اور قبائل کے باہمی معاملات میں طرح طرح کے الجھاؤ پیدا ہوئے۔ نفسانفسی اور افراتفری نے امن و سکون کو خطرہ میں ڈالدیا۔ آخر کار صدیوں کے تلخ تجربات کے بعد مختلف قبیلوں نے مل جل کر اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کچھ مشترکہ اصول اور دستور وضع کئے۔ یوں رفتہ رفتہ سماجی ضابطے وجود میں آئے اور باہمی افادیت کی وجہ سے انھیں تقدس کا درجہ حاصل ہوتا گیا۔

نسل قایم رکھنے کی جبلّت :۔ اس جبلّت کے تحت آدمی ابتدا میں بغیر کسی حجاب اور امتیاز کے من مانے طور پر جنسی خواہش پوری کیا کرتا تھا۔ لاکھوں برس بعد جا کر اس کے ذہن میں معاشرے کو پاک رکھنے، باہمی جھگڑوں سے بچنے اور نسل کی اصلیت برقرار رکھنے کے تصوّرات پیدا ہوئے چنانچہ بعض وہمی عقاید عقلی دلائل اور عصبیتی جذبات کی بنیاد پر اس نے اس سلسلہ میں بھی کچھ اصول طے کئے۔ یہی ابتدائی اصول آگے چل کر قبیلے قوموں اور مذہبوں کے اخلاقی و مذہبی ضابطوں کی بنیاد بنے۔ مختلف ممالک قبائل اور معاشروں میں ان ضابطوں کی کس طرح طرح نشوونما ہوئی؟ انھیں مذہبی اور اخلاقی درجہ کس طرح حاصل ہوا؟ ان اہم سوالات پر تحقیق و تفتیش کے ذریعہ عہد حاضر کے علما اور محققین نے بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں۔

نفسیات، جنسیات، عمرانیات وغیرہ کے علوم اسی جبلت کی کارفرمائیوں کی پیداوار ہیں۔

تحفظِ ذات کی جبلت :- ابتدا سے لے کر آج تک انسان کو اپنی ذات اور اس سے متعلقہ لوازمات کے تحفظ کی فکر دامن گیر رہی ہے۔ زندگی کی سلامتی کو پیش آنے والے خطرات یا ان کے اندیشوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے اس نے توہمات کی گود میں پناہ لی۔ جنوں، بھوتوں اور دیوتاؤں پر اعتقاد لایا۔ سورج، چاند، ستاروں، دریاؤں، پہاڑوں اور جانوروں کی پرستش کی۔ غیبی طاقتوں کی نظرِ عنایت حاصل کرنے کے لئے قربانی۔ جادو منتر اور پرستش کے طریقے اختیار کئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان سب باتوں کے باوجود تا حال اسے جان و مال کے خوف سے مکمل آزادی حاصل نہ ہوسکی۔ عبادتیں، ریاضتیں، صدقات، گیان دھیان کوئی چیز اسے طمانیتِ قلب نہ دے سکی۔ افراد قبائل، قوموں، اور ممالک کے مابین شکوک، منافرت اور عداوت روز افزوں ہے۔ تباہی اور اچانک موت کا خطرہ بڑھتا جارہا ہے۔ زہریلی گیسیں، ناپام بم، ایٹم اور ہائیڈروجن بم بنانے کی جنونی دوڑ ہورہی ہے۔ دور مار راکٹ اور بین براعظمی میزائل کی تیاریوں کے مقابلے ہورہے ہیں۔ عالمگیر دھڑے بندیاں اقوام و ممالک کو لپنے شکنجوں میں جکڑتی چلی جارہی ہیں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کب اچانک کیا ہوجائے۔

بلاشبہ ان اندیشوں کے خاتمہ کے لئے امن، عدم تشدد، اور بقائے باہمی وغیرہ کی بھی تحریکیں شروع کی گئیں مگر بقول شخصے "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ تعصب خودغرضی یا باہمی شکوک کی وجہ سے یہ تحریکیں مخلصانہ عمل اور ردِّ عمل نہ پیدا کرسکیں۔

خوف اور منافرت کی یہ فضا محض عالمگیر یا بین الاقوامی درجوں تک محدود نہیں۔ دنیا کے تقریباً سبھی ملکوں کے اندر ایک دہشتناک کشمکش جاری ہے ایک ہی قوم ایک ہی نسل یا ایک ہی مذہب و فرقہ کے لوگ بھی ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ طاقتور کمزور کے حقوق غصب کرنے اور اس کا امن مانا استحصال کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نفسا نفسی اور لوٹ کھسوٹ کی کشمکش میں ہر فرد کے جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ غیر یقینی ہے۔

نفرت کی جبلت ۔ یہ جبلت نقصان وا ذیت کے احتمال، حسد و رقابت کے جذبات اور احساسِ کمتری پر بنیاد رکھتی ہے ۔ اگر آپ افراد قبائل اور اقوام کی باہمی منافرت کے اسباب کا تجزیہ کریں گے تو ان کی تہ میں آپ کو انہی میں سے کوئی بات نظر آئے گی ۔ انسانیت اور تہذیب کی بقاء اور ترقی کے لیے نفرت سے بڑا اور کوئی خطرہ نہیں یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں، اولیاؤں، مصلحوں، اوتاروں اور رشیوں نے مختلف پیرایوں میں باہمی رواداری محبت اور عشق کی تبلیغ کی ۔ انسانی گروہوں کو مساوات اور اخوت کے رشتے میں منسلک کرنے اور معاشرہ میں امن و عافیت کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لیے مذہبوں، فلسفوں اور سماجی قدروں کی بنا ڈالی ۔

یہ احترام آدمیت کی انہی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ ایسے شہر اور ملک وجود میں آئے جن میں مختلف رنگ، نسل، زبان، فرقہ، عقیدہ، مذہب، اور قبیلہ کے لوگ ساتھ ساتھ رہتے بستے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ تنگ نظر اور متعصب لوگ نفرت کی بجھتی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دے کر شر و فساد کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں ۔ خطرناک ترین آگ مذہبی و فرقہ وارانہ منافرت کی ہے ۔ یہ بھڑکتی بھی جلد ہے ۔ اس کے شعلے بھی دیرپا ہوتے ہیں، اور ان کی لپیٹ اور تباہ کاریوں کا دائرہ بھی وسیع ہوتا ہے ۔ حالات کی کتنی ستم ظریفی ہے کہ بانیانِ مذہب نے تو مذہب سے انسانی برادری کو وسیع بنانے اور اخوت و محبت کو عام کرنے کا کام لیا ۔ مگر پیروانِ مذہب اس کے بالکل برعکس مذہب سے برادری کا دائرہ گھٹانے اور نفرت و تشدد پھیلانے کا کام لے رہے ہیں ۔

خود نمائی کی جبلت :- مشہور کہاوت ہے "قدرت نے کسی کو حسن و عقل سے محروم نہیں کیا ۔" چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی فرد اپنے آپ کو کمتر سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا ۔ ہر شخص خود کو حسن و عقل کا پیکر تصور کرتا ہے ۔ ایک حد تک یہ خود اعتمادی ضروری بھی ہے اور اچھی بھی ۔ مگر یہ خود اعتمادی جب خود فریبی کی شکل اختیار کر جاتی ہے تو آدمی میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور دوسروں سے اپنی بڑائی منوانے کے لیے طاقت تشدد اور اقتدار کے ذرائع اپناتا ہے ۔

افراد کی یہ انانیت معاشرہ کی قدروں کو درہم برہم کر دیتی ہے اور انسانی اتحاد

اور امن و ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن جاتی ہے۔ آدمی کو خود پرستی کے اس عذاب سے نجات دلانے کے لئے مذاہب نے تزکیہ نفس کے وظائف اور رہبانیت وغیرہ کو علاج کے طور پر تجویز کیا مگر اس کا جو نتیجہ نکلا ظاہر ہے۔

تشدد کی جبلت :- کچھ حیوان گوشت خور ہوتے ہیں کچھ سبزی خور۔ آدمی میں ان دونوں اقسام کے جانوروں کی صفات موجود ہیں۔ مل جل کر رہنے کی عادت اس میں سبزی خوری کی وجہ سے پیدا ہوئی اور معمولی سی بات پر مشتعل ہو کر تشدد پر اُتر آنا گوشت خوری کا ورثہ ہے۔ بہیمیت یا درندگی کی اسی صفت کی وجہ سے وہ جنگ و فساد کرتا ہے۔ اور تشدد کے کارناموں کو بہادری اور جوانمردی کا نام دیتا ہے۔ طاقتوروں کا کمزوروں کو ستانا۔ جنگجو قبیلہ کا کم لڑاکو قبیلہ پر تسلط جمانا۔ فوجی برتری کی بنا پر کسی ملک پر قبضہ کرنا۔ دولت کی بنیاد پر ناداروں کا استحصال کرنا وغیرہ وغیرہ سب اسی جذبہ کی پیداوار ہیں۔

بعض مذاہب نے اس جذبہ کو وحشیانہ اور انسانی سماج کے لیے نقصان کار قرار دے کر سبزی خوری اور اہنسا کی تعلیم دی۔ بعض مذاہب نے اسے فطری جذبہ سمجھ کر اس سے فائدہ اُٹھانے کی تلقین کی۔ بہرحال اب تک آدمی اس جذبہ کی خرابیوں سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکا ہے۔

انسانی ذہن و عقاید کی ارتقاء پر جبلتوں کے ان اثرات کے مطالعہ سے اہل نظر پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مذہب و اوہام کی ابتداء کس طرح ہوئی اور کس طرح ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ موجودہ صورت تک پہونچے۔ اگر ان سارے مدارج کا اجمالی تجزیہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل بنیادی نتائج سامنے آجاتے ہیں۔

۱- مذہبی عقیدوں کی ابتداء انسان کو دورِ وحشت میں محسوس ہونے والے خوف اور اندیشوں کی بنا پر اوہام پرستی سے ہوئی۔

۲- ان اندیشوں سے نجات پانے کے لئے شروع میں جادو منتر ٹونے ٹوٹکوں اور قربانیاں وغیرہ دینے کے طریقے اختیار کئے گئے۔ جن کا مقصد موہوم غیبی طاقتوں

کی تسخیر یا خوشنودی حاصل کرنا تھا۔

۳۔ موجودہ دور کے جملہ مذاہب جن میں ہندو دھرم۔ بدھ مت۔ عیسائیت۔ اسلام۔ جین مت۔ دینِ زرتشت۔ یہودیت۔ چین کا تاؤازم و کنفیوشس ازم۔ جاپان کا شنٹوازم۔ اور دوسرے سارے مختلف مذاہب شامل ہیں۔ ان سب میں ابتدائی دور کے عقیدوں اور رسموں وغیرہ کا کچھ نہ کچھ عنصر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

مثلاً :۔

زمینی و فلکیاتی مادی اور جاندار چیزوں کی روحوں کا اعتقاد۔ غیبی طاقتوں کی تسخیر اور رضامندی کے لئے قربانیاں کرنا۔ چڑھاوا چڑھانا۔ بعض الفاظ کے ورد یا جاپ کی تاثیر کا اعتقاد۔ لوبان اور دھوپ وغیرہ جلانا۔ دھاگہ تعویذ باندھنا اور سعد و نحس وغیرہ وغیرہ کے تصورات یہ سب دورِ وحشت کے قدیم عقاید ہی کا ورثہ ہیں۔

۴۔ جدید منظم مذاہب زیادہ سے زیادہ گزشتہ پانچ ہزار برسوں کی ایجاد ہیں۔

۵۔ مذاہب و عقاید کی طرح اگر موجودہ سماجی قوانین کی بنیادوں کی چھان بین کی جائے گی تو پتہ چلے گا کہ ان میں سے بہتوں کے سلسلے عہدِ قدیم کے قبائلی دستوروں اور اصولوں سے مل جاتے ہیں۔

۶۔ یہی حال دورِ حاضرہ کے اخلاقی ضابطوں کا ہے۔ تحقیق کرنے پر کتنے ہی رائج اخلاقی ضابطے قدیم قبائلی قدروں کے رہینِ منت نظر آئیں گے۔

۷۔ مذاہب کا آغاز کثرت پرستی کے عقیدہ سے ہوا۔ ثنویت (اہرمن و اہرمزد) تثلیث (باپ۔ بیٹا۔ روح القدس) اور توحید، فکرِ مذہب کی ارتقاء کے مختلف مرحلے ہیں۔

۸۔ ابتدائی مذاہب میں خداؤں کو غضبناک اور قہار تصور کیا جاتا تھا۔ مہربان اور کریم خداؤں کا تخیل بہت بعد کا ہے۔

۹۔ جدید عقلی و قیاسی علوم اور سائنسی ایجادات کے فروغ کے بعد مذہبی عقیدوں

اوہام ۔ ضابطوں ۔ رسموں اور عبادتوں وغیرہ کے سلسلے ماند پڑ گئے ہیں ۔

۱۰ ۔ قانونِ ارتقاء کے مطابق، جس کو قرآن پاک نے دینِ فطرت کا نام دیا ہے ۔ جملہ مذاہب ایک دوسرے کے بعد یا ساتھ ساتھ ترقی کرتے آئے ہیں ۔ اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان کے رواجوں میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ۔

۱۱ ۔ جدید منظم مذاہب کے بانیوں اور ان کے شارحین نے بھی قدیم عقاید و دستور اور عبادات و رسومات میں وقت معاشرہ اور حالات کے مطابق تبدیلیاں کی ہیں ۔ کچھ باتیں سابقہ دور کی رہنے دی ہیں اور کچھ باتیں لوگوں کے تبدیل شدہ مزاج کے مطابق نئی داخل کی ہیں ۔ عالمگیر مذاہب اسی عمل سے وجود میں آئے ہیں ۔ اور ان میں اجتہاد کی گنجائش اسی حقیقت کے پیش نظر رکھی گئی ہے ۔

۱۲ ۔ بانیانِ مذہب کی جانب سے فوق العقل علم اور الہامی معلومات کے دعوے کی ایک وجہ لوگوں میں اپنے نیک پیغام کی اہمیت کا احساس پیدا کرنا تھا ۔

ان بنیادی نکات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح خاندان مل کر قبیلہ بناتے ہیں اور قبیلے مل کر قوموں کی تشکیل کرتے ہیں یا چھوٹے چھوٹے دیہات مل کر تحصیل ۔ ضلع ۔ کمشنری ۔ صوبے اور ملک کی صورت اختیار کرتے ہیں ۔ اسی طرح مختلف قبائل کے قدیم عقاید و دستور، عبادتوں کے طریقے اور رسم و رواج وغیرہ نے کچھ ردو بدل اور نئے اضافوں کے ساتھ عالمگیر مذاہب کی شکل اختیار کی ہے ۔

گہرائی میں جانے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مذاہب کی پیدائش کے بنیادی محرکات خوف اور امیدیں ۔ جن سے رنج و راحت، سزا و جزا ۔ نیک و بد ۔ فنا و بقا اور پرستش و عبادت وغیرہ کے عقاید و مسائل پیدا ہوئے ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح علم و سائنس پر مختلف عالموں اور حکیموں نے مختلف نظریات کا اظہار کیا ہے اسی طرح کائنات کی پیدائش ۔ روحوں کے وجود ۔ حیات بعد الممات ۔ اعمال کی جزا و سزا ۔ زندگی اور اس کے مقاصد کے بارے میں بھی مختلف نبیوں ۔ اوتاروں اور مصلحوں نے اپنے اپنے افکار پیش کئے ہیں ۔

یہ بات قطعی واضح ہے کہ بانیانِ مذہب نے معاشرہ کے بڑھتے ہوئے مطالبات کے مطابق جس طرح اپنے سے پہلے کے سماجی اور اخلاقی ضابطوں میں ردّ و بدل کیا ہے اسی طرح اپنے عہد کے ذہنی تقاضوں کے پیش نظر انھوں نے سابقہ افکار میں ترمیم و تنسیخ بھی کی ہے۔ یوں نہ فقط چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے بلکہ ہر مذہب اپنے دور کی ایک ترقی پسند اور رفاہی تحریک کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ اپنی اس حیثیت میں ہر مذہب نے انسانی برادری کا دائرہ وسیع کیا، معاشرہ کی ترقی میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کیا اور امن و تہذیب کو فروغ دینے کا سبب بنا۔

جب تک کسی مذہب کا یہ کردار باقی رہا، اس کے سربراہوں اور پیرودں میں اپنوں اور غیروں کے لیے رواداری اور فراخدلی قائم رہی۔ "کیا اور کیوں" سے لے کر اجتہاد و اختلاف تک کو ناگوار نہ سمجھا گیا۔ دوسروں کو ہم مسلک بنانے کے لیے صرف عملی مثالوں کی دلکشی اور دلائل کی معقولیت کو اہمیت دی جاتی رہی۔

مگر پھر جب ترقی پسند اور رفاہی تحریک کے بجائے مذہب صرف "عقیدہ" بن کر رہ گیا تو اس کے شارحین و مبلغین ماضی پرستی کا شکار ہو گئے۔ روایتی تصورات اور عہدِ قدیم کے اخلاقی و سماجی ضابطے پتھر کی لکیر قرار دیدیئے گئے۔ معاشرہ کے ترقی پذیر تقاضوں سے آنکھیں بند کر لی گئیں اور عقل و فکر کے استعمال کو ممنوع قرار دیدیا گیا۔

نتیجہ ان باتوں کا یہ ہوا کہ پیروانِ مذہب تعصّب اور تنگ نظری کے دائروں میں محدود ہوتے گئے۔ اس حد تک کہ وہ ایک مخصوص معاشی مفاد رکھنے والے گروہ کی شکل اختیار کر گئے۔ پھر جس طرح طاقتور قومیں اپنے سے کمزور قوموں پر تسلط قائم کر کے بین الاقوامی سامراج بنتی ہیں اسی طرح بڑی مذہبی جمعیتیں چھوٹی مذہبی جمعیتوں کو ہڑپ کر کے مذہبی سامراج کی حیثیت اختیار کر گئیں۔

ان دونوں قسموں کے سامراجوں میں فرق صرف یہ ہے کہ بین الاقوامی سامراج طاقت اور دولت کی برتری کی دلیل پر کمزور ملکوں کا استحصال کرتا ہے۔ جب کہ

مذہبی سامراج "بہترین عاقبت" کے تصوّر کی بنیاد پر کمزور یا اقلیتی مذہبی گروہوں پر تسلّط قائم کرتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج ہر بڑے مذہب میں بیشتر شارحین کے گروہ موجود ہیں۔ یہ حضرات اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کی خاطر یہ دعویٰ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بنی نوع انسان کے موجودہ جملہ مسائل کا حل صرف ان کے مذہب کے ذریعہ ہی ممکن ہے دوسرے مذاہب نہ صرف اس حل سے خالی ہیں بلکہ ان کے پیرو ملحد، کافر اور اینٹی کرائسٹ ہونے کی وجہ سے جہنم کے بھی حقدار ہیں۔ گویا حق وصداقت کی اجارہ داری اور جنّت ودوزخ کی ٹھیکیداری صرف انہی حضرات کی میراث ہے۔ کسی مخصوص گروہ میں اس قسم کے خیالات کو چاہے کتنا ہی اچھا اور مفید کیوں نہ سمجھا جائے لیکن انسانی اتحاد، عالمی امن اور معاشرہ کی ترقی کے نقطۂ نظر سے یہ خیالات مذاہب کی اصل روح اور ان کے مقاصد اعلیٰ سے انحراف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان باتوں سے تعصّب ونفرت اور فتنہ وفساد کی تو بنا پڑی ہے مگر آدمیت، امن اور ترقی کی بنیادوں کو سخت نقصان پہونچا ہے۔ اگر تنگدلی اور تنگ نظری سے اب بھی پیچھا نہ چھڑایا گیا تو ہم سب ایسی ہولناک تباہی سے دوچار ہوسکتے ہیں جس کے مقابلے میں ماضی وحال کی تباہ کاریاں ہیچ نظر آئیں گی

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

بابِ دوم

مذاہب کے اجزائے ترکیبی

گزشتہ باب میں اجمالی طور پر جو حقیقتیں پیش کی جا چکی ہیں ان کا لب لباب یہ ہے:

اپنے دورِ وحشت میں انسان طرح طرح کے خوف اور اوہام کا شکار ہوا۔ چنانچہ بچاؤ اور تسکین خاطر کے لئے اپنی فہم اور وسائل کے مطابق اس نے بعض خیالات اور ٹونے ٹوٹکے ایجاد کئے۔ یہ باتیں آگے چل کر جادو اور منتر وغیرہ کے آغاز کا سبب بنیں

تجربات انسان کے علم و شعور اور حالاتِ زندگی میں تبدیلی اور ترقی پیدا کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ اس میں ارواح یا غیبی طاقتوں کے وجود کا عقیدہ پیدا ہوا۔

غیبی طاقتوں کے قہر سے محفوظ رہنے یا ان کی عنایت حاصل کرنے کے لئے قربانیوں۔ پرستشوں۔ عبادتوں اور بعض رسموں کے طریقے رواج میں آئے۔

بعض اشیاء یا جانوروں کے سعد و نحس یا نیک و بد ہونے کے تصورات کی بنیاد پڑی۔

جبلتوں کی بے لگامی کی وجہ سے اجتماعی زندگی کو جو نقصانات پہونچتے تھے ان سے بچنے کے لئے بعض سماجی و اخلاقی قدروں یا ضابطوں کی ترویج کی گئی۔

اور آخر کار یہی ساری باتیں مل جل کر مذہب اور منظم مذہب کے وجود کا آغاز

کا سبب بنیں۔

اس تجزیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جادو اور مذہب کے اسباب پیدائش اور مقاصد ابتدار میں ایک ہی تھے۔ یعنی عناصر فطرت اور غیبی طاقتوں کا خوف اور انسانی برادری کی عافیت اور ترقی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مقصد حاصل کرنے کے لئے دونوں نے جو طریقے اور عمل اختیار کیے ان میں بھی کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔

مثال کے طور پر آدمی یا جانور کی قربانی یا بلیدان کرنا۔ خون چھڑکنا گوشت پھیلانا۔ ہڈیوں۔ گوشت اور بالوں کو جلانا۔ دھونی دینا۔ بعض مخصوص الفاظ کے ورد یا جاپ میں تاثیر جاننا۔ دائرہ کھینچ کر اس کے اندر بیٹھنا اور مسلسل منتر یا وظائف کے عمل کے ذریعہ جنوں بھوتوں وغیرہ کو قبضہ میں لانے کی کوشش کرنا بیماری کو غیبی روحوں کا عتاب سمجھنا مریض پر سختی کرنا یا جھاڑ پھونک کرنا۔ دھاگہ تعویذ کا استعمال کرنا۔ روحوں کو کھانے پینے کی اشیاء نذر کرنا۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب طریقے ابتدائی دور کے مذاہب اور جادو دونوں ہی میں مروج تھے۔ جادو منتر کے طریقوں پر سر جان فریزر کی کتاب مستند اور تفصیلی تحقیق پیش کرتی ہے۔ جس کے مطالعہ کے بعد اس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ مذہب اور جادو کے عقاید و اعمال میں بہت سی باتیں مشترک رہی ہیں۔

ان دونوں میں سب سے پہلے کس کا وجود ہوا۔ اس پر علمار کا اختلاف ہے۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ جادو مذہب سے قدیم ہے۔ اس بات پر البتہ کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ جادو نے عناصر فطرت اور غیبی طاقتوں کے مقابلے میں انسان میں اپنی ہمت طاقت اور قابلیت پر اعتماد کرنے کے رجحان کو اپنانے کی بنا ڈالی۔ اور مذہب نے اس کے مقابلہ میں انسان کی بے بسی اور کمزوری کے رجحان کو جنم دیا۔

رجحانات کے اس فرق نے آگے چل کر دونوں کو الگ الگ راہوں پر ڈال دیا۔ جادو کی فکر ترقی کرتی ہوئی ، اور اپنی الگ راہ پر چلتی ہوئی حکمت اور سائنس تک آپہونچی۔ اور مذہب کی فکر نے ترقی کرتے ہوئے ارواح عاقبت اور

حیات بعد الممات، کے عقاید تک رسائی حاصل کی اور کثرت پرستی کے مدارج سے گزرتی ہوئی وحدانیت کی منزل پر آکر فائز ہوگئی۔ تاہم اس تضاد یا اختلاف کے باوجود بحیثیت تحریک دونوں کی اصل غایت انسانوں کی عافیت، فلاح اور ترقی ہی رہا۔

اب آیئے ذرا ہم عالمی مذاہب کے اجزائے ترکیبی معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ معلومات اور حقائق پر غور کرنے سے مجھے ان کے مندرجہ ذیل صیغے معلوم ہوئے ہیں۔

۱۔ کائنات اور ارواح کی پیدائش کے متعلق عقاید یا معلومات۔ جسے ہم الہٰیات کا صیغہ کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ اخلاق اور تزکیۂ نفس سے متعلق اصولوں کا صیغہ جسے ہم طریقت کا نام دے سکتے ہیں۔

۳۔ مذہبی رسومات، فرائض اور عبادات کا صیغہ۔

۴۔ سماجی ضابطوں کا صیغہ جو عام طور پر شریعت یا فقہ کے نام سے مشہور ہے۔

ان میں الہٰیات چونکہ مذاہب کا پہلا اور بنیادی صیغہ ہے اس لئے اس پر میں ذرا زیادہ تفصیل سے بحث کروں گا۔ تاکہ قارئین اس مسئلہ کی حقیقت اور پس منظر سے کما حقہٗ واقف ہو سکیں۔

۱۔ الہٰیات

مذہب کے اس صیغے سے مندرجہ ذیل اہم باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

(الف) کائنات کی پیدائش اور اس کے مختلف حصوں کا علم۔

(ب) ارواح کے وجود اور تسلسل حیات کا عقیدہ۔

(ج) خلقت کے منصوبہ اور مقاصد کی توضیح۔

(الف) **کائنات کی پیدائش اور اس کے مختلف حصوں کا علم**:۔ میں اس موضوع کو تین حصوں میں تقسیم کروں گا۔ ایک سماوات کی پیدائش اور نظام۔ دوسرے زمین اور جاندار اشیاء کی پیدائش و ارتقاء اور تیسرے انسانوں کی پیدائش اور ارتقاء۔

سماوات کی پیدائش اور نظام:- جہانتک میری معلومات کا تعلق ہے دنیا کے جملہ مذاہب اس موضوع پر یا تو بالکل خاموش رہے ہیں یا انھوں نے اپنے دور کے بعض ہیئت دانوں کے ناقص نظریات اپنائے ہیں۔ ہندوستان، مشرقِ وسطیٰ۔ یونان۔ مصر اور چین کے قدیم ہیئت دانوں کے وہ نظریات جو بعض مذاہب نے اختیار کیے۔ ان میں بیشتر دورِ حاضرہ کی معلومات اور تحقیقات کی کسوٹی پر غلط ثابت ہو چکے ہیں اور بہتوں میں ترمیم اور اضافے کیے گئے ہیں۔ چنانچہ آج کسی کا یہ دعویٰ کرنا کہ اس کے مذہب کے بانی یا صحیفہ نے اس موضوع پر کوئی حتمی اور ابدی معلومات پیش کی ہیں حقیقت سے لاعلمی یا ضدی پن کے ثبوت کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

آج کے دور میں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ زمین گول نہیں چپٹی ہے اور انتہا تک اس کے ایسے ہی سات طبق ہیں۔ سات آسمان ایک دوسرے کے اوپر چھتوں کی طرح اُستادہ ہیں۔ ستارے آسمان کے سائبان پر جڑے ہوئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ تو بلا مبالغہ اس کی ان باتوں پر لوگ ہنسے بغیر نہ رہ سکیں گے چاہے وہ اپنے ان اقوال کی تائید میں کسی بھی صحیفہ یا بانیٔ مذہب کے ارشادات کو پیش کرے علمِ سماوات یا علمِ ہیئت آج قطعی طور پر مذاہب کے دائرۂ عقاید سے نکل کر سائنسی تحقیق و تفتیش کے حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ اس موضوع پر اب کوئی بھی مذہب سائنسی معلومات کی نہ صحیح رہنمائی کر سکتا ہے اور نہ ہی چیلنج دے سکتا ہے۔

زمین اور جاندار اشیاء کی پیدائش وارتقا:- سماوات یا اجرامِ فلکی کی طرح اس موضوع پر بھی مذاہب اور اس کے بانیوں نے کوئی تفصیلی روشنی نہیں ڈالی۔ یہ علم حاصل کرنے کے لئے بھی انسان کو مذہب کے بجائے سائنس ہی کی رہنمائی حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

انسان کی پیدائش اور ارتقاء:- عالمی مذاہب نے انسان کی پیدائش کے بارے میں دو خاص نظریئے یا عقیدے پیش کیے ہیں۔ ان عقائد کی ہم آہنگی کی بنیاد پر ہم انھیں دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک گروہ میں یہودیت۔ عیسائیت اور اسلام آجاتے

ہیں اور دوسرے میں ہندو دھرم۔ جین مت اور بدھ مت۔

پہلے گروہ کے عقیدہ کے مطابق خدا نے کائنات کو سات دنوں میں پیدا کیا۔ حضرت آدم کو مٹی سے اپنی صورت بنا کر اس میں روح پھونکی۔ نسل انسانی کا سلسلہ حضرت آدم سے شروع ہوتا ہے۔

اس گروہ کے علماء کے عقاید کے مطابق حضرت آدم کو وجود میں آئے زیادہ سے زیادہ سات ساڑھے سات ہزار برس گذرے ہیں گویا اس سے پہلے کرۂ ارض پر نسل انسانی مفقود تھی۔

جدید سائنسی معلومات اس عقیدہ یا نظریہ کو یکسر غلط ثابت کرتی ہیں۔ اس بات کے واضح ثبوت فراہم ہو چکے ہیں کہ انسان دنیا میں لاکھوں برس سے رہتا آیا ہے۔ اس بارے میں سائنس کی پیش کردہ شہادتوں کو ہٹ دھرمی یا تنگ نظری کے علاوہ کسی اور طریقہ سے رد نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے گروہ کے مذاہب انسان کی کروڑوں برس کی قدیم زندگی کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ بات ذرا سائنسی معلومات سے کچھ مطابقت رکھتی ہے۔ لیکن نوع انسانی کی ابتداء اور ارتقاء کے بارے میں ان کے پیش کردہ عقاید یا نظریے دیومالائی قصوں کہانیوں سے زیادہ کوئی علمی حیثیت نہیں رکھتے۔

صرف جدید سائنس ہی اس موضوع پر تجربہ تحقیق اور شہادتوں کی بنیاد پر واضح نظریات پیش کرتی ہے۔ ہر چند کہ ان نظریات کو حرف آخر یا ہر طرح مکمل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ پھر بھی یہ دونوں گروہوں کے مذاہب کے پیش کردہ نظریات سے زیادہ درست اور قابلِ فہم ہیں۔

اس کے علاوہ چونکہ مذاہب اس موضوع پر مزید تفصیلی معلومات یا تحقیقات پیش کرنے کا سلسلہ ختم کر چکے ہیں اور سائنس پوری توجہ اور عزائم کے ساتھ سرگرم جستجو ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں بھی ہمیں سائنس ہی کی رہبری پر تکیہ اور اعتماد کرنا پڑ رہا ہے۔ علم الارض، علم الآثار، علم الحیات، اور علم الانسان وغیرہ، ہم اس بارے میں ہماری مذاہب

کے عقیدوں سے زیادہ بہتر رہنمائی کر رہے ہیں۔

(ب) **ارواح کے وجود اور تسلسلِ حیات کا عقیدہ** :- واضح تشریح کی خاطر اس موضوع کو میں دو حصّوں میں تقسیم کروں گا۔ ایک ارواح کے وجود کا اعتقاد، دوسرے تسلسلِ حیات کا عقیدہ۔

ارواح کے وجود کا عقیدہ ۔ روح کے مجرد ہونے یعنی مادہ سے علیحدہ ایک وجود ہونے کا تصوّر بہت قدیم ہے۔ اس کی ابتدا، انسان کے دورِ وحشت کے اوہام و عقاید سے ہوئی ہے۔ جدید سائنسی علوم نے عقل و تجربہ کی بنیاد پر بیشتر قدیم عقاید و نظریات کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ مگر یہی ایک مسئلہ ایسا ہے جس کے بارے میں سائنس اب تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکی۔

اس بارے میں قرآنِ پاک کی آیت ہی اب تک تجربات کی کسوٹی پر پوری ثابت ہوئی آئی ہے۔ "قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی وَمَا اُوتِیتُم مِنَ العِلمِ اِلَّا قَلِیلاً" ۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے اس آیت میں کہا گیا ہے: "لوگ تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ یہ اسرارِ الٰہی میں سے ایک ہے۔ انسان اس کی حقیقت کے علم کا صرف قلیل حصّہ پا سکتا ہے۔"

ابتدا میں روح کے وجود کا اطلاق لاتعداد اشیا اور موجودات پر کیا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تصوّر ملائک۔ شیطان۔ جن۔ بھوت، انسانوں اور جاندار مخلوقات کی ارواح کے اعتقاد پر محدود ہو گیا۔ اکثر موجودہ مذاہب اب سورج۔ چاند۔ تاروں۔ سیاروں۔ پہاڑوں۔ درختوں۔ سمندروں اور دریاؤں وغیرہ کی روحانی حیثیت و قدرت پر اعتماد نہیں رکھتے۔ حالانکہ خود ان کی مذہبی دیومالائیں اب تک فطرت کے ان مظاہر کی روحانی کارگزاریوں کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔ ممکن ہے سائنس کی مزید تحقیقاتی کامیابیوں کے بعد ارواح کی موجودہ تعداد میں اور بھی کمی ہو جائے۔

بہر حال روح کا عقیدہ موجودہ مذاہب کی پیدائش سے بہت قدیم ہے۔ موجودہ عالمی مذاہب نے اس کے بارے میں بعض نظریات پیش کیے ہیں۔ جدید سائنس تاحال

تردیدِ روح کے سلسلہ میں کوئی جامع اور ٹھوس ثبوت نہیں پیش کر سکی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید علوم اور سائنس کے معترف لوگوں کی اکثریت آج بھی ارواح کے ازلی اور ابدی وجود کی قائل ہے۔

تسلسلِ حیات کا عقیدہ :۔ دورِ وحشت کے انسانوں اور قدیم مذاہب میں ارواح کی پیدائش اور تسلسلِ حیات کے بارے میں جو عقیدے رائج رہے ہیں جدید علوم کی مدد سے ان پر مسلسل تحقیقات کی جا رہی ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبلِ قریب میں اس سلسلہ میں کچھ زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں۔ فی الحال اس مسئلہ کے بارے میں چار نظریات رائج ہیں۔

۱۔ الہامی مذاہب کا نظریہ۔ ۲۔ غیر الہامی مذاہب کا نظریہ۔ ۳۔ ویدانت اور وحدت الوجود کا نظریہ۔ ۴۔ میٹریلزم یا دہریت کا نظریہ۔

میں ان کا الگ الگ تعارف پیش کروں گا۔

۱۔ **الہامی مذاہب کا نظریہ** :۔ الہامی مذاہب سے میری مراد یہودیت ۔ عیسائیت اور اسلام ہے۔ ان مذاہب کا نظریہ یہ ہے کہ روزِ الست کے دن خدا نے جملہ روحوں کو پیدا کیا ہے اور عالمِ ارواح کو ان کا مسکن بنایا ہے۔ وہاں سے حکم خدا کے مطابق ایک ایک روح دنیا میں آتی ہے۔ مقررہ جسم میں مقررہ مدت گزارتی ہے۔ اس کے بعد عالم برزخ میں چلی جاتی ہے۔

قیامت کے دن یہ ساری روحیں اپنے اپنے جسموں میں واپس آجائیں گی۔ نیکی بدی کا حساب دیں گی، اور آخر میں اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا حاصل کرنے کی خاطر جنت یا دوزخ میں بھیجدی جائیں گی۔

اس عقیدہ کے مطابق ہر روح روزِ ازل سے منفرد پیدا کی گئی ہے۔ کروڑوں برس وہ عالمِ ارواح میں گزارتی ہے مختصر مدت کے لئے دنیا میں آتی ہے اور پھر واپس چلی جاتی ہے۔

۲۔ **غیر الہامی مذاہب کا نظریہ** :۔ میں اس گروہ میں ہندو دھرم ۔ بدھ مت اور جین مت کو شامل کرتا ہوں۔ ان مذاہب کے مطابق بھی روحوں کو منفرد طور پر پیدا

کیا گیا ہے مگر وہ اس کا کوئی وقت متعین نہیں کرتے ۔ ان مذاہب کا عقیدہ ہے کہ روح اور مادہ دونوں ازلی و ابدی ہیں ۔ کروڑوں برس سے روح اپنے کرموں کے پھل کے مطابق مختلف اجسام اختیار کرتی رہتی ہے ۔ پہلے وہ جمادات میں حلول کرتی ہے پھر نباتات کے قالب میں آتی ہے ۔ اس کے بعد وہ حیوانات میں داخل ہوتی ہے اور ترقی کرتے کرتے انسانی جسم میں ڈیرہ جماتی ہے ۔ اب اگر اس حال میں اس سے ہر طرح نیک اعمال سرزد ہوئے تو وہ جون بدلنے کے چکر میں آزاد ہو جاتی ہے یعنی نروان حاصل کر لیتی ہے ۔ لیکن اگر اس سے اعمالِ بد سرزد ہوں تو ان کی پاداش میں وہ پھر آواگون کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے ۔ نجات کے بعد روح کا کیا انجام ہوتا ہے ۔ اس بارے میں یہ مذاہب کوئی وضاحت نہیں کرتے ۔

۲۔ **ویدانت اور وحدت الوجود کا نظریہ** :- یہ دو نام فی الحقیقت ایک ہی قسم کے نظریہ کے ہیں ۔ بظاہر ان میں سے ایک اہلِ ہنود اور دوسرا اہلِ اسلام کی فکر کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت ان ناموں سے ظاہر ہونے والا نظریہ یا عقیدہ کسی بھی ایک فریق کی اصل ایجاد نہیں ۔ ابتدا سے لے کر آج تک ہر ملک اور قوم کے حقیقت شناس افراد اس اعلیٰ نظریہ کی آبیاری کرتے آئے ہیں ۔

اس گروہ کے عقیدہ کے مطابق ازل میں روح اور مادہ کا جدا جدا وجود نہ تھے ۔ حقیقی وجود صرف ذاتِ الٰہی کا تھا ۔ مادہ اور روح سب اسی ذاتِ حقیقی کے مظہر و صفات ہیں ۔ انسانوں اور جانداروں کی علیحدہ روحوں کی خلقت کا تصور فریبِ نظر ہے ۔ ان کی حیثیت آفتابِ الٰہی کی کرنوں جیسی یا بحرِ حقیقت کے قطروں کی مثال ہے ۔ جن کا کوئی منفرد یا مجرد وجود نہیں ۔ سب کا منبع و مرکز واحدِ مطلق ہے ۔

مسلم صوفیائے کرام نے کلامِ الٰہی کی آیت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔ یعنی ہم سب خدا کے پاس سے آئے ہیں اور اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں ۔ سے اسی نظریہ کی تائید کی ہے ۔ وادیٔ سندھ کے جلیل القدر اہل اللہ بزرگ اور صوفی شاعر سچل سرمست نے اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے ۔

صورت جو سبحان پاڻ ڏسڻ آهي پنهنجو تماشو

"یعنی یہاں اللہ کے سوا اور کوئی بھی موجود نہیں۔ یہ مختلف صورتیں صرف اسی کے ذوقِ تماشا کی مظہر ہیں۔ سارے روپ اسی کے ہیں۔ ہر روپ میں وہ اپنی نیرنگیوں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔"

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے بھی اپنے ان اشعار میں اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے ؎

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

نیز

آپ آئینہ ہستی میں ہے خود اپنا حریف
ورنہ یاں کون ہے جو تیرے مقابل ہوتا

جو شخص اس عظیم نظریہ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔ وہ مکتسب اور غیر مکتسب مذاہب کی فرقہ بندیوں، تعصبات اور رسمی عقاید و عبادات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ محبت اور فلاح انسانی کو اپنا شعار بناتا ہے۔ جنت و دوزخ اور نرگ و سورگ کے نام پر انسان کو انسان کا دشمن بنانے والوں کی حقیقت سے باخبر ہو جاتا ہے۔ اور یقین کے ساتھ بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

سچ کہا ہے بیدل فقیر نے ؎

بحرِ عمیق دچ جو ئی پوسی
دین و کفر دا ورقا دھوسی

"بحرِ حقیقت کی گہرائیوں میں جو بھی غوطہ زن ہوگا اس کے ورقِ دل سے دین و کفر کے تعصبات دھل جائیں گے۔"

۴۔ **میٹریلزم یا دہریت کا نظریہ** :- روح کے مسئلہ پر اس گروہ کے ماہرین علوم نے منطقی استدلال اور سائنسی تجربات دونوں ہی کی مدد سے غور کیا ہے۔ وہ اپنی ان کسوٹیوں کی بنیاد پر روح کے علیحدہ وجود سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اصل

چیز صرف مادہ ہے زندگی اور موت کو وہ مادہ کے داخلی توازن کا بناؤ اور بگاڑ قرار دیتے ہیں۔ بقول چکبستؔ ہے

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

گویا مادہ کے ظہورِ ترتیب سے زندگی وجود میں آتی ہے۔ صاحبِ ذہن کی صورت میں نمودار ہو کر انفرادیت پاتی ہے اور جب اس کے اجزائے ترکیبی کا توازن بگڑ جاتا ہے تو انفرادی موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ لیکن مادہ کے کسی خاص مرکب کی موت کا مطلب مادہ کی عمومی موت نہیں۔ مادہ لافانی ہے اور اپنے ظہورِ ترتیب سے مختلف النوع زندگیوں کو جنم دیتا رہتا ہے۔

مادّیین کا یہ نظریہ ویدانت کے نظریہ سے ملتا جلتا ہے۔ دونوں حیات بعد الممات اور عاقبت کے تصور کی نفی کرتے ہیں۔ دونوں دنیا کو ابدی اور لافانی جانتے ہیں۔ دونوں انسانی مساوات اور فلاح کو اہمیت دیتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مادّیین نے روح کے علیحدہ وجود سے قطعی انکار کیا ہے اور ویدانتی روح اور مادہ کو ایک ہی ذاتِ اعلیٰ کی دو الگ صفات تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ **خلقت کے منصوبہ اور مقاصد کی توضیح** :- کائنات کی پیدائش اور نظام کے بارے میں اس وقت دو نظریئے رائج ہیں۔ ایک نظریہ کے مطابق کائنات ایک منصوبہ Plan کے مطابق پیدا ہوئی ہے اور اس کا نظام ایک ضابطہ کے مطابق چل رہا ہے۔ دوسرے نظریہ کے مطابق کائنات کی پیدائش اور نظام کی بنیاد حادثوں Accidents پر ہے۔

اس میں پہلے نظریہ کی حمایت Idealism عقیدہ پرستی کا فلسفہ کرتا ہے۔ دوسرے نظریہ کی حمایت Materialism دہریت کا فلسفہ کرتا ہے۔

جملہ عالمی مذاہب پہلے نظریئے کے حامی اور معتقد ہیں۔ اسی نظریئے کے تحت وہ کائنات کے خالق اور منتظمِ اعلیٰ طاقت کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے خدا

ایشور - اور گاڈ God وغیرہم کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

خدا کے وجود پر ایمان مذاہب کی اصل بنیاد یا شرطِ اوّلیں کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مختلف مذاہب میں خدا کی ذات و صفات کے بارے میں مختلف تصوّرات پیش کئے گئے ہیں۔ یہ تین تصوّرات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

Personal God یا شخصی خدا کا تصوّر۔

Impersonal God یا غیر شخصی خدا کا تصوّر۔

God beyond imagination یا وہم و گمان سے بالاتر خدا کا تصوّر۔

ان تینوں تصورات کا اجمالی تعارف یہاں بے محل نہ ہوگا۔

شخصی خدا کا تصوّر :- ابتدائی زندگی میں جب انسان وحشی جانوروں کی مانند رہا کرتا تھا۔ اس کی عقل ناقص اور ذہن ناپختہ تھا۔ اس نے ہر طاقتور اور مفید یا مفر شے کو خدا شمار کیا۔ ان اشیاء میں سماوی اجسام یعنی سورج - چاند - ستارے - عنصری قوتیں مثلاً ہوا، آگ، پانی، زمین وغیرہ اور دیویوں، دیوتاؤں وغیرہ کی غیبی طاقتیں سبھی شامل تھیں۔ یہی نہیں بلکہ خوفناک جانور، طاقتور آدمی، جادوگر، اور مذہبی رہنما بھی اس زمرہ میں آجاتے تھے۔ اس تصوّر کے ارتقاء نے یہ چار اہم مراحل طے کئے ہیں۔

۱۔ کثیر خداؤں کے تصور کا دور۔ ۳۔ تثلیث کے تصور کا دور۔

۲۔ خدا کے دو گروہوں کے تصوّر کا دور۔ ۴۔ وحدانیت کے تصوّر کا دور۔

۱۔ **کثیر خداؤں کے تصوّر کا دور** :- یہ خدا کے تصوّر کا نہایت قدیم مرحلہ ہے لیکن اس تک پہونچنے میں بھی انسان کو ہزاروں سال لگے اور فکر و عقیدت کے مختلف زینے طے کرنے پڑے۔ میری معلومات کے مطابق پہلے انسان صدہا برس تک جانور، طاقتور آدمیوں اور جادوگروں وغیرہ کو خدا سمجھا پھر مدتوں وہ عنصری قوتوں کے دامِ فریب میں الجھا رہا اور انھیں اپنا معبود قرار دیتا رہا۔ اس مرحلہ سے گزر کر اس نے اجرامِ فلکی کی طرف رجوع کیا۔ اور صدیوں چاند اور ستاروں کو خدا سمجھتا رہا۔ ہوتے ہوتے اس کی فکر

کی رسائی غیبی طاقتوں اور روحوں کے تصوّر تک ہوگئی۔ چنانچہ وہ ہر مادّی شے کی روح کو خدائی طاقت تسلیم کرنے لگا تھا۔ بادشاہ۔ پروہت اور ریفارمر (مصلحین) وغیرہ خدا کے اوتار یا دیوتا شمار کیے جانے لگے۔ طرح طرح کے فوق العادت کرشمے ان سے منسوب ہونے لگے۔ دیومالائی قصوں کہانیوں کا دور شروع ہو گیا۔ اس دور میں ہر قبیلے اور ملک کا خدا الگ تھا۔ جب قبیلے باہم مل کر قوم کی شکل اختیار کرتے تو مشترکہ مندروں یا عبادت گاہوں میں ہر قبیلے کے خدا کا بت یا نشان رکھا جاتا۔ اس دور کے خدا یا دیوتا قہر و غضب کا پیکر تصوّر کیے جاتے تھے۔

۲۔ خداؤں کے دو گروہوں کے تصوّر کا دور :۔ آگے چل کر جب انسان نے کچھ اور ذہنی ترقی کی تو غضبناک خداؤں اور دیوتاؤں کے علاوہ رحیم و کریم خداؤں کا تصوّر بھی ان کی فہم نے قبول کیا۔ اس نئے تصوّر نے ابتدا میں خداؤں کی کثرت میں کوئی کمی نہیں کی۔ ہاں ان کو دو گروہوں میں ضرور تقسیم کیا۔ ایک گروہ میں ظالم اور قہار دیوتاؤں کو شامل کیا گیا اور دوسرے گروہ میں مہربان دیوتاؤں کو۔

آگے چل کر اسی فکر کی ترقی مادّی خداؤں کے تصوّر کے زوال اور غیبی خداؤں کے تصوّر کے عروج کا سبب بنی۔ ثنویت کا نظریہ اسی ارتقائے فکر کا مظہر ہے۔ اہرمن و یزداں کا تصوّر اسی نظریہ کی پیداوار ہے۔

۳۔ تثلیث کے تصوّر کا دور :۔ ثنویت کے بعد یہ خدا کے شخصی تصوّر کا زیادہ ترقی یافتہ دور سمجھا جاتا ہے۔ ثنویت سے پہلے صرف غضبناک خداؤں کا تصوّر پایا جاتا تھا۔ ثنویت کے دور میں مہربان خداؤں کا تصوّر بھی وجود میں آ گیا ہر چند کہ اہرمن و یزداں کے نظریہ نے کثیر خداؤں کے تصوّر کو نیکی اور بدی کی صرف دو اعلیٰ غیبی طاقتوں میں مرکوز کر دیا تھا۔ پھر بھی یہ دونوں طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار سمجھی جاتی تھیں۔ جن کے مابین کسی سمجھوتہ کا امکان نہ تھا۔ یہ بات ترقی پسند اذہان کی بے چینی کا سبب تھی۔ تثلیث کا تصوّر اسی بے چینی کی پیداوار ہے۔ اس نظریئے نے دو حریف خداؤں کے بجائے تین حلیف خداؤں کا عقیدہ پیدا کیا۔

ہندو دیومالا کے برہما۔ وشنو اور شیو۔ مصری دیومالا کے اوسیرس۔ آئسس اور

ہورس، اور عا یائیت کے باپ ۔ بیٹا اور روح القدس اسی عقیدہ کے مظہر ہیں ۔

۴ ۔ **وحدانیت کے تصوّر کا دور :-** تثلیت کے بعد وحدانیت کے تصوّر کا آغاز ہوتا ہے ۔ یہ شخصی خدا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ تخیل تھا۔ جس میں ماضی کے خداؤں کی جملہ طاقتیں اور صفات ایک ہی ذاتِ اعلیٰ سے منسوب کر دی گئیں ۔ اللہ ایشور اور یہوداہ ایسی ہی ذات اعلیٰ کے مختلف نام ہیں ۔

یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ خدا کے بیان کردہ یہ چاروں تصورات بہر حال شخصی یا مادی نوعیت کے تھے ۔ غیر شخصی خدا (Impersonal God) کا تصوّر اس کے بعد کا ہے ۔ توریت ، انجیل، قرآن پاک اور ویدوں میں انسانوں کی طرح خدا کی بھی شکل وصورت اور مرکزِ قیام کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ اور خدا کو انسانی صفات سے موصوف کیا گیا ہے ۔

غیر شخصی خدا کا تصوّر :- غیر شخصی خدا سے مراد ایسا خدا ہے ۔ جو قطعی غیر مادی خالص روح اور جوہر ۔ یا منزہ اور مجرد (Abstract) ہے ۔ یہ تصور عالمی مذاہب کے آغاز میں صرف چند برگزیدہ ہستیوں تک محدود تھا ۔ لعد میں جب ان مذاہب کے شارحین کا ترقی یافتہ ممالک کے قیاسی علوم سے واسطہ پڑا ۔ تو یونان ۔ مصر ۔ عراق اور ایران کے فلسفوں کی روشنی میں انھوں نے غیر شخصی خدا کا تصوّر پیش کیا ۔ اس تصوّر کا تعارف کرنے سے پہلے میں جسم اور جوہر کی مختصر تشریح کرنا ضروری خیال کرتا ہوں ۔

جسم یا مادّہ :- فلسفہ کے مطابق جو چیز حواسِ خمسہ کی زد میں آجائے یعنی دیکھنے، چھونے ، سننے ، چکھنے اور سونگھنے سے محسوس ہو سکے اور زمان ومکان اور اسباب کے دائرہ میں آجائے وہ جسم یا مادہ ہے ۔ علمائے قدیم نے جسم کو چار بنیادی عناصر کا مرکب بتایا تھا ۔ یہ عناصر آگ ۔ پانی ۔ ہوا اور زمین تھے ۔ علمائے جدید نے ماضی کے ان بنیادی عناصر کو بھی مرکب ثابت کر دیا ہے اور تاحال ۲ ، (بہتر) بنیادی عناصر دریافت کر چکے ہیں ۔

روح یا جوہر :- فلسفوں کی تشریح کے مطابق وہ شے جو پانچوں حواسوں کے ذریعہ محسوس ہو سکے ۔ زمان ومکان اور اسباب کے دائروں سے باہر ہو وہ جوہر یا روح ہے ۔

مادیین اور بیشتر سائنسدان روح کے جداگانہ وجود اور اس کے حیاتِ ابدی کے قائل نہیں لیکن حقیقت شناس عالم صوفی اور درویش اب بھی منطقی طور پر اس پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اسی بنیاد پر غیر شخصی خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

اب میں پھر غیر شخصی خدا کے تصوّر کی حقیقت پیش کروں گا۔ خدا کے اس تصوّر کو اپنانے والے اسے لامکان۔ لازمان۔ لا اسباب۔ شکل و صورت سے مبرا۔ حاضر و ناظر اور حق و مطلق سمجھتے ہیں۔ اس تصوّر کے مطابق خدا ایک ایسی غیبی طاقت ہے جو کائنات کی ہر شے کو پیدا کرتا ہے۔ اس کی پرورش کرتا ہے۔ روح کو ایک جسم میں داخل کرتا اور پھر نکال لیتا ہے۔ وہ روح اور جسم سے بالا تر پاک اور جدا ہے۔

خدا کا یہ تصوّر ثنویت اور تثلیث کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ثنویت اور تثلیث کے معتقد اس ترقی یافتہ تصوّر سے بھی منطقی انداز میں اپنے اپنے نظریوں کی صداقت و اصلیت کی دلیل حاصل کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے نظریۂ وحدت الشہود کو بھی اس سے تقویت ملتی ہے۔ اسی تصوّر کی بنیاد پر کافر و مومن۔ حق و باطل۔ خیر و شر اور پاک و ناپاک وغیرہ کے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ جو مختلف مذہبی شریعتوں کی سختی کے باعث بنتے ہیں۔ شرک و توحید کا تعصب بھی اسی تصور کی پیداوار ہے۔ یہی تعصب اہلِ مذاہب کو ایک دوسرے سے متنفر کرکے اپنے پیروؤں کو ماضی پرستی کی راہ پر لگانے کی کوشش کرتا ہے۔

وہم و گمان سے بالاتر خدا کا تصوّر :- اس تصوّر میں خدا کی ہستی اتنی عظیم اور ہمہ گیر ہے کہ فہم و ادراک اور وہم و گمان اسے اپنے دائرہ میں لینے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ عقل چکرا جاتی ہے۔ صاحبِ نظر اس کی گوناگوں تجلیاں اور رنگارنگ مظاہر دیکھ کر دریائے حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ حقیقت شناس اسے ہر جا ہر شے اور ہر روپ میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے مگر اس کی مکمل اور قطعی واضح یا دو ٹوک توصیف نہیں بیان کرسکتا۔ منطق اور سائنس کی رائے اس بارے میں چاہے جو کچھ ہو لیکن خدا کے جملہ ارتقائی تصوّرات میں یہی ایک تصوّر سب سے زیادہ جامع اور قرینِ قیاس محسوس ہوتا ہے۔

مذاہب کے راسخ العلم بزرگوں اور وحدت الوجود۔ ویدانت اور پینتھزم

Pantheism کے فلسفہ پر ایقان رکھنے والے حقیقت شناسوں کا اسی نظریہ پر اعتقاد رہا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اصل وجود صرف ایک ذاتِ حق کا ہے۔ دوسری ساری چیزیں اس کی صفات ہیں۔ طاقت، علم اور حسن کا مخزن وہی ہے۔

اس تصور پر ایمان لانے کے بعد انسانوں کے مابین تفریق و امتیاز اور نفرت و تعصب کو ہوا دینے والی خود ساختہ تحریکیں اور سارے نظریات باطل ہو جاتے ہیں۔ کثرت کے پس منظر میں وحدت کا اعتقاد اسی تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اعتقاد مندرجہ ذیل نظریات کو جنم دیتا ہے۔

۱۔ **جسم و روح دونوں ایک ہی ذات کے مظہر ہیں** :- وادیٔ سندھ کے جلیل القدر اہل اللہ بزرگ اور شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی اس نظریہ کی اس طرح تائید و تبلیغ کرتے ہیں:-

پڙاڏو سو سڏ، ورائي جو جي لهين،
هئا اڳهه گڏ، پر ٻڌڻ ۾ ٻه ٿيا.

"آواز اور گونج دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اصلیت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ پہلے تو دونوں یکجا ہوتی ہیں۔ مگر جب سنائی دیتی ہیں تو دو محسوس ہوتی ہیں۔"

۲۔ **سارے انسان ایک ہی برادری کے فرد ہیں** :- اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فردِ بشر مساویانہ یا ایک جیسے سلوک کا مستحق اور انسانی محبت و احترام کا حقدار ہے۔ کسی پر کسی کو برتری جتانے کا کوئی حق نہیں۔ نسل و رنگ، ملک و قوم اور مذہب و مسلک کی بنیاد پر انسانی گروہوں کے مابین منافرت اور بدامنی پیدا کرنا یا کسی انسانی گروہ کے مفادات کا استحصال کرنا تقاضائے آدمیت کے خلاف ہے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

تو کز محنت دیگراں بے غمی   نشاید کہ نامت نہند آدمی

یعنی سارے انسان ایک ہی جسم کے مختلف اعضا کی مانند ہیں۔ اس لئے کہ سب ایک ہی جوہر سے پیدا کئے گئے ہیں۔ اگر جسم کے کسی ایک حصّہ میں کوئی درد ہوتا ہے تو پورا جسم بے چین رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح تمہیں ہر انسان کے دکھ درد کا احساس کرنا چاہئے۔ اگر تم سے یہ نہیں ہو سکتا تو تم ہرگز آدمی کہلانے کے مستحق نہیں ہو۔

۳۔ کثرت مذاہب کے پس منظر میں وحدت کار فرما ہے:۔ یعنی جملہ مذاہب کی اصل غایت اور ان کے پیروؤں کی نیک خواہشات کا مقصد ایک ہی ہے۔ ظاہری اختلافات یا حد بندیاں محض رسمی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو ان میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اصل غایت اور مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔ جو اصل غایت و مقصد کو عزیز رکھتا ہے، وہ ظاہری اختلافات اور حد بندیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

بیدل فقیر علیہ الرحمۃ اپنے "وحدت نامہ" میں فرماتے ہیں:

حقیقت ۾ هڪ ٿيو   ڪفر ۽ ايمان،
مظهر مولا پاڪ جي   هندو مسلمان،
تارا ڪيا تالان   سورج سندي سوجهري۔

"یعنی کفر و ایمان کی رسمی تاویلیں چاہے ایک دوسرے سے کتنی ہی مختلف ہوں لیکن ان کا مقصودِ حقیقی ایک ہی ہے۔ ہندو مسلمان سبھی مولائے پاک کے مظہر ہیں جس طرح سورج نکلنے پر سارے غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح وحدتِ حقیقی کا عرفان ظاہری اختلافات کی اہمیت کو ماند کر دیتا ہے۔"

۴۔ کائنات کی تخلیق و نظام میں منصوبہ Plan نظر آتا ہے:۔ سائنسی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ نظامِ کائنات بعض معلوم اور نامعلوم اصولوں یا ضابطوں پر جاری و ساری ہے، سورج۔ چاند۔ زمین اور جملہ سیارے سب معینہ راستوں یا محوروں پر گردش کرتے ہیں۔ ان کے مابین ایک اصولی آہنگ قائم ہے۔ تغیرات اور حوادث بھی بعض اصولوں پر مدار رکھتے ہیں۔ یہی سب باتیں ایک عظیم منصوبہ کی دلالت کرتی ہیں۔

قرآنِ پاک کا یہ ارشاد اس خیال کو مزید تقویت پہونچاتا ہے۔ "ماخلقت ھٰذا باطلا" یعنی یہ کائنات یونہی نہیں بنائی گئی ہے۔ حقیقت شناس درویشوں اور مفکرین نے بھی تخلیق و نظام کائنات میں واضح منصوبہ محسوس معلوم کیا ہے اور اسے منشائے ایزدی، قانونِ قدرت اور قانونِ ارتقا کے نام سے موسوم کیا ہے اور اس کا مآخذ عشق یا Power of Integration قرار دیا ہے۔

۵۔ **انسان مظہرِ خدا ہے۔** اس نظریہ کے ثبوت میں صوفیائے کرام نے یہ ارشاداتِ ربانی پیش کئے ہیں۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ — اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں۔ یعنی جو کچھ ہے اللہ ہے۔ اللہ کے سوا کسی چیز کا حقیقی وجود نہیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن — ہم خدا کے مظہر ہیں یعنی ہمارا ملجا و ماویٰ (Destination) وہی ہے۔

وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْن — شاہ لطیف نے اس آیت کی یوں تشریح کی ہے۔

هوت تنهنجي هنج ۾، پڇين ڪوهه پهي!
وفي انفسڪم افلا تبصرون، سوجهي ڪر سهي؛
ڪنڌهن ڪان، وهي، ڪا هوت کولڻ هٽ تي۔

محبوب (اللہ) تمہارے اندر ہی موجود ہے۔ اس کی تلاش میں سرگرداں کیوں ہو۔ وفی انفسکم افلا تبصرون کے ربانی ارشاد کو سمجھو اور دلنشیں کر لو۔ اہلِ دل اپنے مطلوب (اللہ) کو اپنی ذات سے باہر نہیں ڈھونڈھا کرتے۔

یہ نظریہ انسانی عظمت و توقیر کو منشائے ایزدی قرار دیتا ہے اور اتحادِ انسانی۔ امن عالم اور ترقیٔ بنی آدم کو ضروری ٹھہراتا ہے۔

یہ نظریہ انسان کو ٹھوس خود اعتمادی بھی بخشتا ہے اور اس سے آدمیت کے احساس و احترام کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے چکبست نے ؎

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
یہی انسان کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے

۲۔ طریقت

مذاہب کا یہ صیغہ مندرجہ ذیل باتوں سے متعلق ہوتا ہے۔

(الف) اخلاق یا اعمالِ صالحہ

(ب) نفس یا جذباتی خواہشات۔

(ج) ذہن یا عقل و علم

(الف) **اخلاق یا اعمالِ صالحہ** :۔ طریقت کے اس شعبہ میں اخلاق کی درستگی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ نہ صرف موجودہ مذاہب میں بلکہ ایامِ وحشت و جہالت کے ابتدائی مذاہب میں بھی کم و بیش اسے یہی حیثیت حاصل رہی ہے۔

اخلاق یا اخلاقیات کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اس موضوع پر دورِ حاضرہ میں صدہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں اس پر مفصل بحث کرنا میرے اس مضمون کے دائرہ سے باہر ہے۔ ہاں موٹے لفظوں میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اخلاق سے مراد اعمالِ صالحہ کے ضابطوں سے ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان ضابطوں کا معیار کن بنیادوں پر مقرر کیا جا سکتا ہے؟ قدیم ضابطوں کی پیروی کرنے پر کس حد تک اصرار کیا جا سکتا ہے؟

ان سوالات کے صحیح جواب ہمیں اس وقت معلوم ہو سکتے ہیں جب ہم یہ جان لیں کہ:

۱۔ اخلاق کے محرک جذبے Incentives کون سے ہیں؟

۲۔ ان کے بنیادی اصول کیا ہیں؟

۳۔ اخلاقی ضابطے دائمی نوعیت کے ہیں یا وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ان میں ترمیم بھی ہو سکتی ہے؟

۱۔ **اخلاق کے محرک جذبے** Incentives :۔ اخلاقیات کے علماء اور ماہرین نے انھیں دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصّہ کی بنیاد روحانی یا اعلیٰ

جذباتی خیالات پر ہے۔ دوسرے حصہ کی بنیاد مفادِ باہمی پر ہے۔ پہلے حصہ نے مذہبی اخلاقیات کو جنم دیا اور دوسرا حصہ جدید قومی اخلاقیات کا سبب بنا۔

۲۔ **اخلاق کے بنیادی اصول** :۔ ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ افراد۔ اقوام اور معاشرہ کی ترقی اور امن ہی اخلاقیات کے اصولوں کی اصل بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

۳۔ **اخلاقی ضابطے** :۔ اگر اس مسئلہ کو تاریخ کے زاویئے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اخلاقی ضابطوں کی تعمیر میں دو رجحان کام کرتے آئے ہیں۔ ایک مذہبی رجحان دوسرا قبائلی رجحان۔ پہلے رجحان کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے مذہبی قبائل رفتہ رفتہ بڑے مذہبی قبائل میں مدغم ہو گئے۔ اس صورتِ حال نے ایسے مذہبی اخلاق کو جنم دیا جس میں گذشتہ اور چھوٹے مذہبوں کی بعض روایات اور تبدیل شدہ حالات کے تقاضوں اور قیاسی علوم کے زیرِ اثر وجود میں آنے والے نئے ضابطے سبھی شامل تھے۔

ہندوؤں۔ بدھسٹوں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے شریعتی ضابطے اسی طرح وجود میں آئے۔ ان چاروں عالمگیر مذاہب نے جو مذہبی قوانین اختیار کئے وہ سب کے سب خود انھوں نے اپنی جانب سے تخلیق نہیں کئے تھے۔

ہندوؤں کی قدیم کتاب منوسمرتی کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اس کے مذہبی قوانین ماضی کے مذہبی ضابطوں اور حالات و ضرورت کے مطابق تخلیق کئے گئے بلکہ نئے اصولوں کا مرکب ہیں۔ بدھوں کے اخلاقی قوانین عقلی دلائل کی بنا پر وضع کئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا عمل میں آنا مشکل ثابت ہوگیا۔ عیسائیوں نے نئے مذہبی قوانین بنانے کے بجائے قدیم رومن مذہبی قوانین کو اپنایا ہے۔

مسلمانوں نے عرب کے قدیم مذہبی دستوروں میں حسبِ ضرورت ترمیم و اضافہ کرکے اپنے لئے مذہبی دستور مرتب کیا ہے۔ نہ سارے قدیم ضابطے رد کئے ہیں نہ سارے ضابطے نئے اپنائے ہیں۔

اپنے ان ضابطوں کی پابندی کرنے کے لئے مذہب نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔ ایک سزا اور تادیب کا طریقہ جو Curative (معالجاتی) کہلاتا ہے۔ دوسرا تبلیغ و تربیت کا طریقہ جو Preventive (مزاحمتی) کہلاتا ہے۔ اس

طریقہ کو دفاعی یا انسدادی طریقہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور تزکیہ نفس سے ہے اس لئے اس کا مفصل ذکر آئندہ صفحات میں ان عنوانوں کے تحت کیا جائیگا۔ اسی طرح پہلا طریقہ چونکہ مذاہب کی شریعتوں سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کا ذکر بھی آگے اسی عنوان کے ذیل میں کیا جائیگا۔

غرض جس طرح مذہبی رجحان نے مرکب مذہبی دستوروں کو جنم دیا ہے۔ اسی طرح قبائل کے سماجی ضابطے مل جل کر قومی سماجی ضابطوں کے تار و پود بنے۔ انھی ضابطوں میں سے کچھ کو رد اور کچھ کو اختیار کر کے نیز وقت کی ضرورت اور قومی مفاد کے پیش نظر کچھ نئے ضابطوں کا اضافہ کر کے مرکب قسم کے ملکی دستور وضع کئے گئے۔

اس پس منظر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جملہ اخلاقی ضابطے چاہے وہ مذہبی نوعیت کے ہوں یا سماجی نوعیت کے حالات کے مطابق تبدیل ہوتے آئے ہیں۔ آئندہ بھی قانونِ ارتقار کے مطابق جیسے جیسے معاشرہ میں تبدیلی آئے گی ان میں تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔

عالمی مذاہب کے جو متعصب شارحین ان تبدیلیوں کی راہ میں روڑے اٹکانا چاہتے ہیں وہ اپنی اس خلافِ فطرت کوشش میں تو کامیاب نہیں ہو سکتے، البتہ اپنے تنگدلانہ عمل سے وہ اپنے مذہبی نظاموں کے بھرم کو ضرور نقصان پہنچائیں گے۔ آج دنیا کا کوئی بھی وہ شخص جو تبدیلیوں کے عوامل اور ان کی رفتار کے مطالعہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب تمام بنی نوع انسان ایک ہی ملے جلے دستور العمل کی پیروی کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ایسے عالمی دستور العمل میں اقوام و مذاہب کے جملہ ضابطوں کو بہر حال مدغم ہونا پڑے گا۔

(ب) **نفس یا جذباتی خواہشات** :- مذاہب کے صیغۂ طریقت میں اصلاحِ نفس کو بھی خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ نفس کو دوسرے لفظوں میں جذباتی خواہشات بھی کہا جا سکتا ہے۔ اہلِ نظر درویشوں نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ نفسِ امارہ

۲۔ نفسِ لوامہ

۳۔ نفسِ مطمئنہ

ان میں سے ہر ایک کا مختصر ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

۱۔ **نفسِ امّارہ** :- یہ انسان کی فطری خواہشات یا جبلتوں Instincts سے تعلق رکھتا ہے۔ باب اول میں ان جبلتوں کی مختصر تشریح پیش کی جا چکی ہے۔ جدید علم نفسیات کے ماہرین ان پر تحقیقات کر کے صدہا کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان کاوشوں کا ماحصل پیش کرنے کی ان اوراق میں گنجائش نہیں۔

سب کا نچوڑ ایک جملہ میں یہ ہے کہ جذباتی خواہشات کی من مانی تکمیل، اتحاد اور امن و ترقی کو خطرہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ افراد میں نفسا نفسی۔ نفاق۔ تعصب۔ تشدد اور خود فریبی کے نفسیاتی امراض پیدا کر دیتی ہے۔ جس سے معاشرہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

۲۔ **نفسِ لوامہ** :- یہ انسانی نفس کا ترقی یافتہ درجہ ہے۔ جو آدمی کو عقل و تجربہ کا استعمال سکھاتا ہے۔ خود غرضی و ایثار۔ نفاق و اتفاق۔ نفرت و محبت۔ تشدد و برداشت۔ تکبر و انکساری۔ تعصب و رواداری اور خود فریبی و حقیقت پسندی وغیرہ کے فرق کو واضح کر کے آدمی میں مفید و مضر کی تمیز پیدا کرتا ہے۔ جس کی بنا پر اخلاقی قوانین بنائے جاتے ہیں۔

لیکن اخلاقی مسائل محض نیک و بد کی تمیز یا اس کے احساس سے حل نہیں ہو جاتے اس کے لئے قوت و جرأتِ عمل بھی لازمی ہوتی ہے۔ جو صرف صحیح تربیت اور تزکیۂ نفس سے حاصل ہوتی ہے۔

صحیح تربیت اور تزکیۂ نفس کے حصول کے لئے اہلِ تصوف نے چار طریقے بتائے ہیں۔ ایک۔ گرو یا مرشد کی ہدایت و صحبت۔ دوسرے صحیح علم کی واقفیت۔ تیسرے عبادت۔ چوتھے عشق۔

ان میں سے "صحیح علم" کا بیان نفسِ مطمئنہ کے بعد آگے چل کر

مذاہب کے عیغہ نمبر ۳ کے عنوان کے تحت کروں گا۔ یہاں صرف مرشد کی ہدایت کے بارے میں وضاحت ضروری خیال کرتا ہوں۔

مرشد کی ہدایت و صحبت :- زمانۂ قدیم سے مذاہب کے گروہ طریقت میں ہدایت کے لئے گرو یا مرشد سے رجوع کرنے کا طریقہ رائج رہا ہے۔ آج بھی دنیا کے کروڑوں افراد کسی نہ کسی مرشد، پیر، فقیر، راہب یا بھکشو وغیرہ وغیرہ کے حلقۂ ارادت سے وابستہ ہیں۔ ماضی میں اس ادارہ Institution نے بنی نوع انسان کو مختلف تعصبات کے چنگل سے آزاد کرانے اور آدمیت و رواداری کو فروغ دینے کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن آج کا حال قطعی مختلف ہے۔ اب بہت کم لوگ اس ادارہ سے فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ اس لئے کہ مدت سے یہ بھی تحریک نہ رہنے سے
Vested
Interest صرف روایت بن کر رہ گیا ہے اور اب شریعت کی طرح ایک مفاد کی متعہ Interest کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ ان حالات میں تزکیۂ نفس یا اخلاقی اصلاح کے سلسلے میں اس ادارہ سے توقع رکھنا مشکل ہوگیا ہے۔

اس صورتِ حال سے متاثر ہوکر ایک درویش نے کہا تھا۔

حریفاں بادہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

یعنی بزمِ عشق کے ہم مشرب بادۂ ہدایت کے جام پلا کر جاچکے اب ان کے میکدے خالی پڑے ہوئے ہیں۔

شاہ لطیف بھٹائی نے بھی اس قحط الرجال سے متاثر ہو کر فرمایا ہے۔

ويا مي وينجهار هيرو لعل ونڊبن جي،
تنبن سندا پوٽيان ٿيهي لڳن نه سار،
ڪنين ڪٽ لهار تنبن سندي پٿين!

"جوہرات سب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ زندگی ایسے لوگوں سے بھری ہے جو شیشے کی بھی پہچان نہیں رکھتے۔ اب تو جدھر جاؤ لوہار ہی لوہار دکھائی

ڈالوں گا۔ جس طرح فزیکس اور تجرباتی علوم حاصل کرنے کے لئے طلبار کو اسکول کالجوں اور یونیورسٹیوں میں برسوں ایک نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے اسی طرح ہر مذہب کی صحیح روحانی تعلیم۔ تزکیۂ نفس اور آرائشگی اخلاق کے خواہشمند افراد عہد قدیم سے پیران طریقت کے اداروں سے اکتساب فیض کرتے آئے ہیں جنھیں خانقاہوں اور آشرموں وغیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ان اداروں میں طریقت کے جملہ مسائل کی تعلیم اور پاکیزگی اخلاق و تطہیر نفس کی باضابطہ تربیت دی جایا کرتی تھی ۔

مرشد کا ادارہ :۔ اب میں رشد و ہدایت کے اس ادارہ کے بارے میں کچھ تفصیلی روشنی ڈالوں گا۔

اپنی کارکردگی کی بنیاد پر اس ادارہ نے جتنی مقبولیت اور عقیدت عامہ حاصل کی معاشرہ کسی دوسرے ادارہ کو اس کی توفیق آج تک نہ ہو سکی ۔ لیکن یہی مقبولیت اور عقیدت، اس ادارہ کی اصلیت اور افادیت کو ختم کرنے کا سبب بنی ہے ۔

عوام الناس پیروں اور درویشوں کے پاس اولاد و مال کی مرادیں اور بیماری و مشکلات سے نجات کی امیدیں لے کر حاضر ہونے لگے ۔ چنانچہ اپنا بھرم رکھنے یا اقتدار و منفعت حاصل کرنے کی لالچ میں وہ بھی لمبے چوڑے دعوے کرنے لگے ۔ جیسے قدرت کے سارے کاروبار کی کنجیاں انھیں کے پاس ہیں ۔ وہ لوگوں کی ہر خواہش محض دعا، تعویذ، وظیفہ اور آسیس سے پوری کر دینے کا ڈھونگ رچانے لگے ۔ ان کے ادارے مکر وریا کے مرکز بن کر مندی کی طرح Vested Interest بن گئے ۔ انھوں نے وہی حیثیت حاصل کر لی جو دور وحشت و جہالت میں جادوگروں کو حاصل رہی ہے ۔

طریقت میں اس قسم کی لایعنی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ۔ کاروبار فطرت پر اثر انداز ہونے کے دعوے ڈینگ اور گمراہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتے ۔

موجودہ دور کے ایسے گندم نما جو فروشوں کا حال پچھلوں سے بھی بدتر ہے ۔ نہ وہ طریقت کے علم سے واقف ہیں نہ اخلاق سے نہ اہلِ دل ہیں اور نہ ہی اہلِ حضور ۔ ان کے ادارے سادہ لوح عوام کے ذہن و مفادات کے استحصال کے اڈے بنے ہوئے

ہیں۔ جن میں صرف جہالت، اوہام اور ضعیف الاعتقادی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ رسمی ذکر و عبادت۔ وظائف و مراقبہ اور جھاڑ پھونک کی نمائش کے سوا اب ان کے پاس کوئی عظمت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ پھر بھی دعویٰ یہ ہے کہ "ہم آسمانِ طریقت کے ستارے ہیں۔ ہمارا وجود دل کی زندگی کا باعث ہے۔" اگر میں اس دعوے کی تردید نہ کروں تب بھی غالب کے الفاظ میں یہ ضرور عرض کروں گا ؎

سینۂ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

نفسِ مطمئنہ :۔ یہی نفسِ انسانی کی معراج ہے۔ جو اس مقام تک جا پہونچے وہ دوسروں کے لئے مثالی یا قابلِ تقلید بن جاتا ہے۔ جس کا نفس اس منزل پر فائز ہوتا ہے اس کے دل و زبان، تکبر و خود نمائی، حرص و آز، ہوا و ہوس، جبر و تشدد اور بغض و کینہ سے یکسر پاک ہوتے ہیں۔ مذہب و عقیدہ، ملک و قوم اور رنگ و نسل کے تعصبات اس کی نگاہوں میں گناہ بن جاتے ہیں۔ اتحادِ انسانی، امنِ عالم اور ترقیٔ بنی آدم اس کا مقصدِ حیات ٹھہرتے ہیں۔ محبت۔ رواداری اور آدمیت کو وہ اپنا شعار بناتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتا ہے۔ بقول شاہ لطیف بھٹائی ۔

پريان سندي پار جي مڙيئي مٺائي،
ڪانهي ڪڙائي، چکين جي چيت ڪري.

" دیارِ حبیب کی ہر شے مٹھاس سے بھری ہوئی ہے۔ اگر تم میں چکھنے کا شعور ہو تو کسی بھی چیز میں کڑواہٹ نہ پاؤ گے۔"

نفسِ مطمئنہ کا حامل شخص سادگی و سچائی اور عمل و احساس ہی کو اصل معیار قرار دیتا ہے اور لفظوں کے ہیر پھیر میں پڑنے کو بے نتیجہ تصور کرتا ہے۔ بیدل علیہ الرحمۃ کا یہ شعر اسی فکر کی ترجمانی کرتا ہے ؎

اکران دي وچ جوني اڙيا،
عشق دي چاڙهي مور نہ چڙهيا.

"جو لوگ الفاظ و حروف ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں وہ رسمی باتوں کے گورکھ دھندے میں چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ بامِ عشق کے زینہ تک پہونچنا اور اسے طے کرنا انھیں نصیب نہیں ہوتا"

نفسِ مطمئنہ کے حامل افراد علم و معرفت۔ عشق و پریم اور احساس و عمل کی اعلیٰ منزلوں پر فائز ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ صحیح معنوں میں دوسروں کی رہبری کر سکتے ہیں۔

(ج) ذہن یا عقل و علم :- اخلاق اور نفس کی طرح طریقت میں ذہن کی ترقی و اصلاح کو بھی بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔

سائنسدانوں کی تحقیقات کے مطابق قدرت نے نباتات اور حیوانات کو بھی کچھ نہ کچھ سمجھ کا مادہ عطا کیا ہے۔ جسے وہ ذہن یا Mind کا نام دیتے ہیں۔ علمِ نباتات و حیوانات کے ذریعہ اس حقیقت پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔ انسان اس بارے میں دیگر جملہ مخلوقات سے زیادہ خوش قسمت ہے اسے سب سے زیادہ ذہن عطا ہوا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ذہن سے علم پیدا ہوتا ہے اور علم ہی سے ذہن پرورش اور ترقی پاتا ہے۔ اہلِ فکر درویشوں اور عالموں نے علم کے یہ چار خاص شعبے مقرر کئے ہیں۔

۱۔ ظنی یا وہمی علم
۲۔ وہبی یا الہامی علم
۳۔ عقلی یا تقابلی
۴۔ تجرباتی علم یا سائنس

کیفیت ان علوم کی یہ ہے:

۱۔ ظنی یا وہمی علم :- یہ وہ علم ہے جو اشیاء کے سطحی مشاہدہ اور ظن پر بنیاد رکھتا ہے۔ مثلاً کسی اثر انگیز متحرک چیز کو دیکھ کر یہ گمان کر لیا جائے کہ اس کی طاقت یا حرکت کا سبب اس کے اندر کی روح ہے۔

اسی وہم کی بنا پر ابتدائی عہد میں سورج۔ چاند۔ ستاروں۔ بادل۔ دریاؤں سمندروں ہواؤں بجلی اور آگ وغیرہ کو ارواح کا مظہر تصور کیا گیا تھا۔ اور مختلف قسم کی آوازوں جیسے

کہ بادلوں کی گرج۔ پانی کے بہاؤ کا شور۔ آتش فشاں پہاڑوں کی گڑگڑاہٹ۔ ہوا کی سنناہٹ اور درختوں و شاخوں کی باہمی رگڑاہٹ وغیرہ کو غیبی طاقتوں سے منسوب کیا جاتا تھا۔

جادو اور مذہب کے ابتدائی عقیدوں کی بنیاد اسی وہمی علم پر ہے۔ اس کی وجہ سے بعض جانوروں اور اشیاء کو سعد و نحس تصور کرنے اور بعض پرستشوں و قربانیوں میں تاثیر جاننے کی ابتداء ہوئی۔ آج بھی لاکھوں برس گزر جانے کے باوجود بہت سے لوگ ابتدائی عہد کے اوہاموں کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔

۲۔ وہبی یا الہامی علم :- لوگ صدیوں سے اس خاص علم کے قائل رہتے آئے ہیں۔ پیغمبر۔ حکیم۔ فلسفی۔ شاعر اور درویش ہمیشہ اس علم کے مدعی رہے ہیں۔ ان سب کا اس کے بارے میں یہ خیال رہا ہے کہ دوسرے علوم کی طرح یہ محنت یا تجربے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف نوازشِ غیبی سے حاصل ہوتا ہے۔ بقول شخصے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بلا شبہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض افراد غیر معمولی صلاحیت و قابلیت کے مالک ہوتے ہیں۔ مذہب، فلسفہ اور مختلف نظریات کے بانی اور اشیاء کے موجدین اسی قبیل کے لوگوں میں سے ہیں۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ بعض غیر معمولی قابلیت و صلاحیت کے افراد کو پراسرار غیبی قوتوں کا مالک بھی شمار کیا جاتا ہے۔ یہ بات بہت سی غلط فہمیوں کا باعث بنتی ہے جتنے ہی لوگ انھیں غیب دان اور فوق البشر سمجھنے لگتے ہیں۔ کرامتوں معجزوں اور سچی پیشین گوئیوں کی لاتعداد مبالغہ آمیز باتیں ان سے منسوب کر دی جاتی ہیں۔

اگر اس قسم کی باتوں کو سچ مان لیا جائے تو اس کا یہ مطلب نکلے گا کہ نظامِ کائنات بعض افراد کے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔ یہ بات قوانین قدرت کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ یہی وہ خیالات ہیں جن کی بناء پر اوتاروں۔ پیغمبروں۔ درویشوں۔ مہاتماؤں۔ اور پاپاؤں کو بلا لحاظِ زمان و مکان و موضوع ہر علم اور ہر شے و مسئلہ پر حرفِ آخر اور ہر قسم

کی کوتاہیوں سے یکسر پاک تصور کرنے کا عقیدہ پیدا ہوا۔

مذاہب کے شارحین نے اس عقیدہ پر خاص طور سے بہت زور دیا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ غیر معمولی قابلیت و صلاحیت کے مالک بعض بزرگوں کی ہر بات اٹل اور مطلق حق تسلیم کی جاتی ہے اور ان کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ اور یوں ایک قسم کی ذہنی ڈکٹیٹر شپ وجود میں آجاتی ہے۔

مذاہب کے بانیوں، اوتاروں، درویشوں اور مجددوں کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہر مسئلہ میں ان کو حرفِ آخر یا ہر بات میں قابلِ تقلید قرار دینے سے مذہب پر مخصوص گروہ کی اجارہ داری قایم ہو جاتی ہے۔ عقل دلیل اور اخلاق کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور ہر عقیدہ کا مذہبی گروہ ایک الگ مفادی گروہ Vested Interest بن جاتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر گروہ اپنے مذہب کو امن، اتحاد اور ترقی کا علمبردار قرار دیتا ہے۔ لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اپنے اپنے مذہب کو حق اور دوسروں کے مذہب کو کفر اور باطل قرار دینے کی کوشش میں ہر گروہ، تعصب، فساد اور تنزلی کا علمبردار بن جاتا ہے۔

۳۔ عقلی یا تقابلی علم :- اس علم کی بنیاد عقل و استدلال پر ہے۔ فلسفہ، منطق، اور کلام وغیرہ اس کی اہم شاخیں ہیں۔ یونان، ہندوستان، چین، مشرقِ وسطیٰ اور روم سے ابھر کر یہ علم جدید دنیا کے لئے معلومات اور ترقی کا سبب بنا ہے۔ اہلِ مذاہب نے بھی ایک حد تک اسے اپنی حمایت میں استعمال کیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ علم مذہب کے فرسودہ عقاید و نظریات کے لئے سنگین خطرہ کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اکثر شارحینِ مذاہب نے اسے الہامی علم سے کمتر قرار دے کر اپنے پیروؤں کو اس سے دور رہنے کی بھی ہدایت کی ہے۔

بعض مفادی گروہ Vested Interest اسے دوسروں کے ذہنی استحصال Exploitation کے لئے بھی کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً سرمایہ دار، اشتراکی، فسطائی اور رجعت پسند عناصر نے اس علم کو اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا ہے۔

یہ علم مابعد الطبیعات Metaphysics کے علمی اصولوں کی طرز پر منظم کیا گیا ہے۔

۴۔ **تجرباتی علم یا سائنس**:۔ اس علم کی بنیاد ریاضیاتی تجزیوں اور طبیعاتی تجربات پر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس علم سے حاصل شدہ نتائج کو حرفِ آخر سمجھ لیا جائے۔ لیکن جس طرح ریاضی Mathematics کے اکثر فارمولے صحیح ثابت ہوتے ہیں اسی طرح سائنسی علوم کے بیشتر فیصلے بھی درست اور معتبر ہوتے ہیں۔

بنی نوع انسان کے لئے بیان کردہ جملہ علوم میں سے کون سب سے زیادہ مفید اور کارآمد ہوگا؟ اس سوال پر غور کرنے سے پتہ چلے گا کہ پہلی قسم کا وہمی علم انسان کے وحشیانہ دور کی پیداوار تھا۔ موجودہ دور کے لئے وہ قطعی فرسودہ ہو چکا ہے۔ نہ وہ آج کے دور کے مہذب اور ترقی یافتہ انسان کے ذہن کی تشفی کر سکتا ہے اور نہ ہی حالاتِ حاضرہ کے مسائل و معاملات کا حل پیش کر سکتا ہے۔

بقیہ تینوں قسم کے علوم انسانی معلومات اور ترقی میں اضافہ کا سبب بنے ہیں۔ لیکن ان میں سے بھی کسی ایک کو مکمل اور حتمی Infallible جاننا قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ جملہ علوم ذریعہ ہیں اصل مقصد نہیں۔ چنانچہ نہ الہامی علوم پر ہی تکیہ کرنا ہوگا نہ عقلی و سائنسی علوم پر۔ ہاں کشادہ دلی کے ساتھ ہر علم سے استفادہ کرنا بیشک ضروری ہے۔ "راستے بہت سہی، مگر ہر ایک اپنا اپنا زاویہ رکھتا ہے"۔

اوتار، پیغمبر، رشی، ولی، فیلسوف، شاعر اور مصلح سب غیر معمولی اور قابلِ تکریم ہستیاں رہی ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کا دائرہ کار مخصوص رہا ہے۔ ٹیلیویژن ریڈیو، ہوائی جہاز، بجلی، جوہری توانائی، اور ایکسرے وغیرہ کی ایجاد، یا انسانی زندگی اور تمدن کے ہر صیغے کی ابدی رہنمائی ان کا کام نہ تھا۔ چنانچہ پنڈتوں، پادریوں اور ملاؤں کا یہ دعویٰ کہ "ان کے مذاہب بنی نوع انسان کے جملہ مسائل کا مکمل حل رکھتے ہیں۔ صحیح اور آخری نظریہ حیات صرف انہی کا مسلک پیش کرتا ہے" قانونِ ارتقا کے خلاف ہے۔ ایسا دعویٰ صرف مفادی گروہوں Vested Interest کا تحفظ کرنے اور ان کی گرفتوں کو مضبوط بنانے کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

کروڑوں برس کی انسانی زندگی میں وسیع ۔ لیاقت، عقل اور تجربات، کے ذریعہ ہر شے اور ہر مسئلہ پر نئی نئی معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں ۔ وسائلِ حیات اور تمدن کی ترقی کے ساتھ نئے نئے نظریات جنم لیتے رہے ہیں ۔ خوب سے خوب تر کی دریافت ہی انسانی معاشرہ کے فروغ کی بنیاد ہے ۔ اگر اس حقیقت سے آنکھیں بند کرلی جائیں ۔ ماضی کی بعض معلومات اور بعض نظریات کو آخری قرار دے کر تحقیق و تجسس کو کفر قرار دیدیا جائے تو اس کا مطلب معاشرہ کی ترقی اور فروغ کا راستہ مسدود کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا اور یہ بات مذاہب کی اصل غایت کے یکسر خلاف ہوگی ۔

ہم چاہیں تو مذاہب کی فرقہ بندیوں ۔ نظریاتی اختلافوں اور علمی اور سائنسی دریافتوں کی ظاہری کشمکش کے باوجود ان سارے سلسلوں کے پس منظر میں قانونِ ارتقاء اور بنیادی وحدت تلاش کرسکتے ہیں ۔

کسی علم نظریہ یا عقیدہ کا کمال اس میں نہیں کہ اسے محدود یا جامد سمجھ لیا جائے ۔ کمال اس میں ہے کہ اسے بہتے پانی کی طرح رواں دواں سمجھا جائے نئی دریافتوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے اس کے دروازے کھلے رکھے جائیں اور نئے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل ثابت کیا جائے ۔

کسی فرد ۔ قوم یا مذہب کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ علم و عقل اور انسانیت کی فلاح و نجات کی تنہا اجارہ داری کا دعوے کرے ۔ ذاتِ حق اور اس کا علم ایک بحرِ بے پایاں ہے ۔ جسے اس کا کوئی ایک قطرہ نصیب ہو جائے وہ اپنی خوش بختی پر ناز کرسکتا ہے مگر یہ بات اسے زیب نہیں دیتی کہ اس پر اترانے لگے ۔ پورے بحرِ حقیقت پر اپنی ملکیت جتانے لگے اور دوسروں کو اس سے فیضیاب ہونے کے فطری حق سے محروم کردے ۔

اعلیٰ و افضل بات یہ ہے کہ ہم ہر علم و عقیدہ کی وہ باتیں پسند کریں ۔ جو اتحادِ انسانی اور امنِ عالم کو تقویت پہونچاتی ہوں اور معاشرہ کی ترقی اور بہبود کو پیشِ نظر رکھتی ہوں ۔ اور ہر علم و عقیدہ کی ہر اس بات سے اجتناب کریں ۔ جو انسانوں کے مابین نفرت

وتعصب کو ہوا دیتی ہو۔ فتنہ وفساد کے لیے مواد بنتی ہو۔ معاشرہ کی ترقی اور بہبود کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہو۔ اور جو شخصی اور عارضی نفع کو اجتماعی اور دائمی مفاد پر ترجیح دینے کا جواز بنتی ہو۔

جو شخص اس اصول پر کاربند ہو جائے۔ سمجھئے اس نے وہمی۔ الہامی۔ عقلی اور سائنسی علوم نیز مذاہب کے جملہ اعلیٰ تقاضے اور مقاصد بحسن وخوبی پوری کر دیئے۔

۳۔ مذہبی رسومات۔ فرائض اور عبادات

مذاہب کا تیسرا صیغہ عبادتوں۔ پوجاؤں یا Prayers کا ہے۔ مختلف مذاہب کی عبادتیں مختلف ہیں۔ ان سب کا رواج دور وحشت سے شروع ہوا ہے۔ جیسا کہ باب اول میں بیان کیا گیا ہے۔ ابتداء میں ان کا مقصد غضبناک غیبی طاقتوں کی تسخیر یا حصول رضامندی رہا ہے۔ مگر پھر جب انسانی ذہن، معاشرہ اور مذہب نے ترقی کی عبادتوں کے مقاصد مندرجہ ذیل ہو گئے:

۱۔ خدا کی رضا جوئی۔

۲۔ تزکیہ نفس

۳۔ سکونِ قلب

۴۔ نجاتِ آخرت

۵۔ گناہوں کے بوجھ سے چھٹکارا

عبادات ورسومات کی تفصیلی بحث باب چہارم میں پیش کی جائیگی۔ یہاں صرف یہ عرض کروں گا کہ عقل کی کسوٹی پر ان باتوں کو پرکھنے کے بعد جدید دور کے انسان کی نظر میں ان کی سابقہ اہمیت کم ہو گئی ہے۔

اللہ جل شانہٗ
خدا کی رضامندی یا ناراضگی کا شخصی تصور بھی اہلِ نظر کے نزدیک عبث ہے۔
اس قسم کی انسانی صفات سے بالاتر ہے۔

جہاں تک عبادت کے ذریعہ تزکیۂ نفس کا تعلق ہے ہم سب دن رات اپنی آنکھوں سے اُن جملہ حضرات کی پاکیزگیٔ نفس کے کارنامے دیکھتے رہتے ہیں جو نمازوں پوجاؤں اور Prayers کو کبھی قضا نہیں ہونے دیتے۔ عبادت کے سلسلہ میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اس سے قلب روشن ہو جاتا ہے اور انسان خدا، رسول، اولیا اور درویشوں کا دیدار کر سکتا ہے۔ اس خیال پر تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو اس کی غلطی معلوم ہو جائے گی۔ خدا کا دیدار ہونا تو کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ کسی کی نگاہوں کے سامنے آنے ہی سے نہیں بلکہ وہم و گمان اور عقل و قیاس کے دائرہ میں آجانے سے بلند و بالا ہے۔ بقول حافظ شیرازیؒ

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں
کہ ایں جا ہمیشہ باد بدست دام را

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار ہونے کی بات بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ آدمی خواب میں ان کی زیارت کر سکتا ہے۔ لیکن اس رسمی زیارت سے کسی کی کیا اصلاح ہو سکتی ہے۔ جبکہ ابوجہل نے انھیں زندہ اور روبرو دیکھ کر بھی ہدایت نہ حاصل کی۔ نبی کریمؐ ایک زندہ جاوید حقیقت ہیں۔ رحمت اللعالمین ہیں۔ ان کے تصور سے وہی شخص کچھ فیض پا سکتا ہے جس کے دل میں کل بنی نوع انسان کا درد ہو۔ جو تعصبات اور تنگ نظری سے پاک ہو اور جو انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے خلوص کے ساتھ جد و جہد کرتا ہو۔

عبادت کا تیسرا مقصد سکونِ قلب بیان کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ آج بھی دنیا کے کروڑوں انسان مالی پریشانیوں، امراض اور طرح طرح کی دیگر تکالیف میں مبتلا ہونے کے باوجود عبادات سے کافی حد تک تسکین قلب یا سکون حاصل کرتے ہیں۔ سائنسدان، فلسفی اور دہریئے بیاں اسے افیون جیسا نشہ ہی کیوں نہ قرار دیں مگر یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے لاتعداد پریشان حال افراد کے لئے عبادت ایک نفسیاتی سہارے کا کام دیتی ہے۔

چوتھا فائدہ عبادت کا نجاتِ آخرت کی اُمید کہا جاتا ہے۔ اہلِ نظر آخرت کے فائدہ کی اُمید پر عبادت کرنے کو درست نہیں سمجھتے۔ علاوہ ازیں جس موہوم آخرت کا تصور مُلا۔ پنڈت اور پادری کے یہاں ہے صوفیائے کرام اس سے متفق نہیں ہیں۔ بقول غالب ؎

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

عبادت کا پانچواں مقصد گناہوں کے بوجھ سے چھٹکارا پانا قرار دیا جاتا ہے۔ یہ تصور نہایت خطرناک اور نقصان دہ ہے۔ مذہب کے اسی تصور نے ہی ظالموں، راشیوں، بلیک مارکیٹیروں، اسمگلروں، غاصبوں اور ضمیر فروشوں وغیرہ وغیرہ کے لئے پناہ گاہ کا کام دیا ہے۔ یہ عقیدہ، کہ چاہے کیسے ہی گناہ کیوں نہ کئے ہوں عبادت کرنے سے وہ معاف ہو جاتے ہیں، روحِ مذاہب کے سراسر خلاف ہے۔

مذاہب کی مقرر کردہ عبادتوں کے علاوہ بھی بعض باتیں بعض حلقوں میں عبادت کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً ذکر و فکر، مراقبہ، تپسیا اور رقص و وجد نغمہ و سرود وغیرہ۔ کہا جاتا ہے کہ ان ذرائع سے بھی سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ چلئے یہ بات بھی تسلیم ہے لیکن عبادتوں کے مقاصد کے اس جامع تجزیہ سے صرف یہی بات سامنے آتی ہے کہ ان سے صرف سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ ذاتی اور عارضی قسم کا۔ تو کیا مذاہب و عقاید میں عبادات کے صیغے اسی مختصر اور وقتی ذاتی فائدہ کے لئے قائم کئے گئے تھے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

اگر ہم جملہ مذاہب کی عبادات کی اصل غایت و روح تک پہونچ سکیں اور ظاہری طور طریق کو مقصود بالذات سمجھ کر ان میں الجھ کر نہ رہ جائیں تو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں صرف یہی ایک بات رد رد کر ہمارے سامنے آئے گی ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

اعلیٰ ترین اور حقیقی عبادت دردِ دل ہے۔ محبت ہے۔ عشق ہے۔ اس عبادت کا فائدہ اور مقصدِ عظیم ہے۔ اس سے کل بنی نوع انسان دیرپا اور مستقل سکون اور

زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ حقیقت شناس درویش اور منکر اسی عبادت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ محبت اور عشق کیا ہے؟ اسے عبادت کا درجہ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ ذیل میں ان باتوں پر میں کچھ روشنی ڈالوں گا۔

محبت اور عشق:۔ صوفیوں، شاعروں، سنتوں اور یوگیوں وغیرہ نے اپنے پیغامات میں عشق و پریم کو ہمیشہ بہت اہمیت دی ہے۔ جیسا کہ احسان دانش نے کہا ہے ؎

درحقیقت ہے محبت ہی بنائے زندگی
ہے اسی کے دم سے بزمِ دہر میں تابندگی

یہ بات محض غلو یا تخیل کی پرواز نہیں بلکہ صد فی صد درست ہے۔ انسانی معاشرہ عقیدہ اور ذہن کے ارتقاء کی ہر منزل جذبہ محبت کی تعمیری کاوشوں ہی کی مظہر ہے — یہی وجہ ہے کہ جب الفاظ و حروف میں الجھنے والے فلسفہ کو مذہب کی روح تصور کرتے ہیں تو اہلِ دل اور اہلِ نظر ان سے اتفاق نہیں کرتے اور اس کے بجائے عشق کو مذہب کی روح قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر درویش مصری شاہ فرماتے ہیں۔

عشق سارا اسلام، مذہب محبت عین مبارک

شاہ باہو علیہ الرحمۃ تو دراصل ایمان کو بھی عشق کے مقابلے میں ہیچ تصور کرتے ہیں اپنی ایک کافی میں فرماتے ہیں:

ايمان سلامت ھر كوئي منگي عشق سلامت كوني، ھو-
منگن ايمان، شرماون عشقون، دل نون غيرت ھوني، ھو-
جس منزل نون عشق پهچاني ايمان خبر نہ كوني، ھو-
ميرا عشق سلامت ركين "باھو" ايمانون ديان دوني، ھو-

اہل اللہ درویشوں نے عشق کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک عشقِ مجازی، دوسرا عشقِ حقیقی۔ اصلاً یہ دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ یا پہلے کو دوسرے تک پہونچنے کا زینہ یا پل کہا گیا ہے۔ جیسا کہ مولانا جامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

متاب از عشق او گرچہ مجازی است
کہ آن بہرِ حقیقت کارسازی است

(عشق سے منہ نہ موڑو چاہے وہ مجازی ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے حقیقت کی اگلی منزل کی راہ کھلتی ہے)۔

عشقِ مجازی :۔ عام طور پر اس کے سمجھنے میں غلطی کی گئی ہے۔ یا تو اسے نفسانی خواہشات کا جذبہ کہا گیا ہے یا فرد کی شخصی محبّت قرار دیا گیا ہے۔ غلط فہمی کا سبب اس کے مختلف مدارج سے لاعلمی ہے۔ فی الواقع اس کے تین خاص درجے ہیں۔

۱۔ محبوب کی محبت ۔ ۲۔ قوم اور وطن کی محبّت

۳۔ بنی نوع انسان کی محبّت

۱۔ محبوب کی محبت :۔ یہ عشقِ مجازی کا پہلا درجہ ہے۔ اس درجہ کی محبت پیدا ہونے کی تین وجوہات ہیں۔ جنسی یا نفسانی خواہش۔ جذبۂ رفاقت۔ میلانِ طبع۔

جنسی خواہش :۔ دیگر جانداروں کی طرح قدرت نے انسان کو بھی بقائے نسل کی خواہش ودلیعت کی ہے۔ اسی خواہش کی وجہ سے عورتوں کے اندر مردوں کے لیے اور مردوں کے اندر عورتوں کے لئے کشش ہوتی ہے۔ اسی کو جنسی خواہش بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک فطری خواہش ہے۔ اس کی تکمیل نہ گناہ ہے نہ عیب۔

یہ فعل گناہ یا عیب اس وقت بنتا ہے جب اس کا ارتکاب کرنے والا فرد اپنے معاشرہ کے تسلیم شدہ اصولوں اور ضابطوں سے انحراف کرے اور مستقل جنسی رفاقت کے بجائے محض وقتی لذت اس کا مقصود ہو۔ ایسے بے لگام عمل سے معاشرہ کا امن و سکون خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔

بقائے نسل کے فطری تقاضہ کو پورا کرنے کے لیے جنسِ مخالف کی مستقل رفاقت ہی افضل ہے۔ اس سے خاندان کی اکائی وجود میں آتی ہے۔ امن و ترقی و زندگی کی لگن پیدا ہوتی ہے اور اجتماعیت کو فروغ ہوتا ہے۔

جذبۂ رفاقت :۔ آدمی فطری طور پر گروہی زندگی کا عادی ہے۔ تنہائی اس کے لئے بڑا عذاب ہوتی ہے۔ اسی لیے قیدِ تنہائی سنگین سزا سمجھی جاتی ہے۔ گروہی زندگی کی اساس جذبۂ رفاقت پر ہے۔ یہی جذبہ آدمی کو خلوت وجلوت

کا ایک دیرپا ساتھی بنانے پر مجبور کرتا ہے۔ ایسا ساتھی جو اس کی ذاتی زندگی کا بوجھ بانٹے اسے داخلی سکون و آرام بہم پہنچائے۔ چنانچہ ایسے ساتھی کی ضرورت اسے جوڑے کی زندگی گزارنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس شکل میں ساتھی یا محبوب کی محبت صرف جذبۂ رفاقت کی حد تک محدود رہتی ہے اور معاشرہ کی رسمی اکائی یعنی خاندان کو جنم دیتی ہے۔

میلانِ طبع :- ہم خیال اور ہم مزاج ہونے کی بناء پر جو باہمی محبت ہوتی ہے۔ وہ جذبۂ رفاقت اور جنسی خواہش دونوں سے زیادہ پائیدار، کیف آور اور تعمیری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر افراد جیون ساتھی کے انتخاب میں میلانِ طبع کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ اور ہم مزاجِ محبوب کی تلاش میں مدتوں سرگرداں رہتے ہیں۔ مگر ایسا ملاپ حسنِ اتفاق ہی سے ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق یہ حسنِ اتفاق صرف ان جوڑوں کو پیش آتا ہے جو پچھلے جنموں سے ایک دوسرے پر فریفتہ رہتے آئے ہوں۔ مسلم درویشوں کے مطابق ایسے جوڑوں کا رشتہ روزِ میثاق یا یومِ الست ہی سے طے شدہ ہوتا ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی رح سوہنی کی زبان میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جڏهين چيائون،
الست ارواحن کي،
ميثاقان ميهار سان، لڏيون مون لائون،
سو موني ڪيئن پاهون، جو محفوظان معاف ٿيو.

(خالق کائنات نے جس دن روحوں کو پیدا کیا۔ جس دن روحوں نے عہد میثاق کیا۔ اسی دن سے مہیوال کو اپنا بنا چکی ہوں۔ اب میں اپنے اس قول سے کیسے پھر سکتی ہوں۔ ہمارا ازلی رشتۂ محبت بھلا اس دنیا میں کیسے ٹوٹ سکتا ہے)۔

۲۔ قوم اور وطن کی محبت :- عشقِ مجازی کے اس درجہ میں محبت محبوب کی ذات سے بلند ہو کر اجتماعی اور معنوی بن جاتی ہے۔ پہلے درجہ میں ماروی اپنے محبوب کھیت کے لئے تڑپتی ہے۔ دوسرے درجہ میں اسے کھیت کے بجائے اپنے قبیلہ اور بستی کی جدائی کا احساس بے قرار کرتا ہے۔ دوسرے درجہ کی اس محبت کا مرتبہ پہلے

سے صدہا گنا اعلیٰ ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی رح اس محبّت کی عظمت کو ماروی کے کردار میں اس طرح اُجاگر کرتے ہیں۔

واجهائي وطن کي، آءُ جي هت ميا‌س،
گور منهنجي سومرا، کج پنوهارن پاس،
ساري ڏج سرتئين، منجهان ولڙين واس،
مياڻي جياس، جي وڃي مڙهه، ملير ڏ!

[اے سومرا (حاکم عمر کوٹ)! وطن واپس پہونچنے کی حسرت میں اگر میں تیری قید میں یونہی تڑپ تڑپ کر مرجاؤں۔ تو اتنا احسان کرنا۔ دفن کے لیۓ میری لاش میرے عزیزوں کے پاس بھیجدینا۔ اور میرے پیارے دیس کی گھاس جلاکر اچھی طرح میری میت کو دھونی دینا۔ اگر میری لاش ملیر (ماروئ کا وطن) پہونچ گئی تو میں سمجھوں گی مجھے نئی زندگی مل گئی]۔

جيڏا جي تيها، سون مارو مڃيا!

[تو انھیں جو چاہے سمجھ۔ میرے ہموطن جیسے بھی ہیں مجھے پسند ہیں]

تن تن اندر تاڪ، عمر ماروئڙن جا!

[یہ نہ سمجھ کہ اہلِ وطن سے دور ہو کر میں ان کی محبت بھلا بیٹھوں گی۔ میرا جسم تیرے محل میں ہے۔ تو کیا ہوا۔ میرا دل تھرہی تھر (ماروئ کا دیس) ہے اور اس کے گوشہ گوشہ میں میرے ہموطن آباد ہیں]

اي ءَ نه مارن رت، جو سيڻ مٽائن سون تي!

[تیری ساری پیشکشیں میری نظر میں ہیچ ہیں۔ سونے چاندی کے ڈھیروں کے عوض اہلِ وطن کی محبّت کا سودا کرنا ہمارا شیوہ نہیں]

محبّت کے اس درجہ کو درویشوں نے "فنانی الشیخ" سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ محبت قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو قربان کر دینے پر ابھارتی ہے۔

بنی نوع انسان کی محبّت:۔ عشقِ مجازی کا یہ سب سے بلند ترین درجہ ہے۔

اس مقام پر پہونچ کر آدمی گروہی، مسلکی اور قومی خود غرضیوں کی آلائشوں سے یکسر پاک ہو جاتا ہے اور دنیا کے جملہ معاملات کو خالص انسانی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ گویا جزو کو کُل کا۔ کثرت کو وحدت کا اور قطرہ کو دریا کا عرفان ہو جاتا ہے۔ انفرادیت عالمگیر اجتماعیت میں ڈھل جاتی ہے۔ اور غالب کے لفظوں میں پکار اٹھتی ہے ع

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اس منزل سے عشقِ حقیقی کی راہیں کھُلتی ہیں۔ جو اس مقام تک نہ پہونچے، چاہے وہ بحر و بر کا سب سے بڑا زاہد ہی کیوں نہ ہو، راہِ معرفت کی گرد بھی نہ پا سکے گا۔ بھلا جس کا دل مذہبی تعصبات، قومی منافرت، رنگ و نسل کے امتیازات اور اونچ نیچ کے تصوّرات سے پاک نہ ہو، جس کا عمل خوف و لالچ، نمائش و تکبر اور جبر و استحصال سے خالی نہ ہو، وہ محض عبادت و ریاضت سے اس منزل تک کیسے پہونچ سکتا ہے؟

جن صوفیائے کرام نے لفظ رحمت اللعالمین کے معنوں کو سمجھا ہے اور اسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب خصوصی قرار دیا ہے۔ وہ عشقِ مجازی کی اس منزل کو "فنا فی الرّسول" کا درجہ دیتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق رحمۃ اللعالمین کی خوشنودی حاصل کرنے والے کے لئے تعصبات و امتیازات سے بالاتر ہونا لازمی ہے۔ بنی نوع انسان کی محبت کے بغیر رسولؐ کی محبت کا دعویٰ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

عشقِ حقیقی :۔ اسے عشقِ مجازی سے افضل اور عشقِ خدا سے تعبیر کیا جاتا ہے صوم و صلوات اور تسبیح و تہلیل کو شعار بنانے والا مُلّا۔ ڈھولک کی تھاپ پر رقص کرنے والے صوفی۔ ذکر و فکر میں گم رہنے والے پیرانِ طریقت دھونی رمانے والے سادھو۔ سُمرن کرنے والے سَنت۔ گیان دھیان میں مست رہنے والے یوگی، گرجوں کی عظمت بڑھانے والے پادری اور تارک الدّنیا راہب۔ سبھی اپنے اپنے طور پر عشقِ حقیقی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ دعوے مسحور کن بھی ہوتے ہیں۔ اور حیرت انگیز بھی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان میں حقیقت نہیں ہوتی۔ بھگت کبیر نے اپنے مخصوص انداز میں اس المیہ کے بارے میں

فرماتے ہیں ؎

حد حد چلا ھر کوئے، بے حد چلا نہ کوئے
بے حد کے میدان میں، کھڑا کبیرا روئے

لاحد کے میدان میں پہونچنا یا مقامِ معرفت پر فائز ہونا ہی عشقِ حقیقی کے دعویٰ کی سچائی کی دلیل ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ مقامِ معرفت ہی عشقِ حقیقی کا مقصد یا معراج ہے۔ اس مقام تک جا پہونچنا کسی کے لئے آسان نہیں ہے تو ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آدمی کو اپنی ذات کے کھونے اور پانے کا سلیقہ آجائے۔ صوفیائے کرام نے ان دونوں کیفیات کو مقامِ معرفت کی درمیانی منزلیں قرار دیا ہے اور انھیں نفی اور اثبات کے نام دیئے ہیں۔ ان کا مختصر ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

نفی یا خود کو کھونا :- اس کیفیت کے تقاضوں کے اکثر غلط معانی نکالے گئے ہیں بعض نے اس کے لئے نفس کشی کی تلقین کی، بعض نے ریاضت و عبادت کی۔ کسی نے تارک الدنیا ہونے کی شرط لگائی کسی نے موت کی۔ بیشتر نے اس کا مقصد اصلاحِ نفس بھی قرار دیا ہے۔ مثلاً شاہ لطیف بھٹائی رح فرماتے ہیں۔

جي پانئين جوڳي ٿيان، ته ترڪ طمع کي ڪر،
وڃي وهم وجود جا، خاصي ڏيان ڌڙ،
ته ڪٿهن پهچين پڙ، لکجين لاهوت ۾.

(اگر تم راہِ سلوک پر گامزن ہونا چاہتے ہو تو طمع کو یکسر ترک کردو۔ خواہشات اور تعصبات سے چھٹکارا حاصل کر کے فکر میں پاکیزگی پیدا کرو۔ اسی صورت میں تم راہِ طریقت کے سالک اور اہلِ لاہوت میں شمار ہو سکتے ہو۔)

گویا شاہ لطیف نے نفس کی بدترین خرابی "طمع" کو قرار دیا ہے، اور سالک کے لئے اس کے ترک کو شرطِ اوّلین ٹھہرایا ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی بات صحیح ہے۔ انسانی معاشرے میں سارے فتنوں کا باعث یہی طمع یا خود غرضی

ہے ۔ اور اسے انفرادیت پرستی کی خودغرضیاں جنم دیتی ہیں ۔ دیکھا گیا ہے کہ ان خودغرضیوں سے نجات دلانے میں پند و نصائح اور ریاضت و عبادت کے مقابلہ میں عشق مجازی زیادہ مؤثر کردار انجام دیتا ہے ۔ مثلاً اس کا پہلا درجہ جیون ساتھی کی ضرورت پیدا کر کے انفرادیت کو گھر خاندان اور قبیلہ میں تحلیل کرتا ہے ۔ دوسرے درجہ میں خاندانی اور قبائلی انفرادیت، قوم اور وطن کے احساس میں مدغم ہوتی ہے ۔ اور تیسرے درجہ میں قوم اور وطن کی انفرادیت یا خصوصی اغراض کا احساس عالمی اور انسانی مفادات کے احساسات میں ڈھل جاتا ہے ۔ یوں فرد اپنا وجود سلیمہ کے ساتھ اجتماعیت میں ضم کر دیتا ہے ۔ نفی یا خود کو کھونے کے یہی صحیح معنی ہیں ۔ جسے اس کی عظمت کا احساس ہو جاتا ہے ۔ وہ کسی اور بات کو خاطر میں نہیں لاتا ۔ دوسرے طالبانِ حقیقت کو بھی وہ بیدل فقیر علیہ الرحمتہ کے الفاظ میں یہی تلقین کرتا ہے :

سک رمز وجود وڃاوڻ دي،
نهين حاجت پڙهن پڙهاوڻ دي.

سچل سرمست علیہ الرحمتہ عاشقِ معرفت کے لئے حدود و قیود کے دائروں سے آزاد ہونا پہلی شرط قرار دیتے ہیں ۔

اول ڀيري ڀڃ، جي بند خيالات جا،
تنهن پڇاڻان وڃ، ملاجي حيرت ۾.

(اگر تو منزلِ حقیقت تک پہونچنا چاہتا ہے تو پہلی شرط یہ ہے کہ مذہبی امتیازات اور تعصبات کا جو بند تو نے اپنے خیالات و احساسات کے گرد باندھ رکھا ہے اسے مسمار کر دے اس کے بعد پھر کوئی رکاوٹ تیرے آڑے نہ آئے گی ۔ تو اپنی منزل پالے گا ۔)

غرض انفرادیت کو غیر محدود اجتماعیت میں جذب کر دینا ہی "نفی یا خود کو کھونے" کا اصل تقاضا پورا کرتا ہے ۔ یہی تیاگ ہے ۔ یہی نجات ہے ۔ یہی نروان ہے اور اسی کو صحیح معنوں میں Salvation کہا جا سکتا ہے ۔

اثبات یا خود کو پانا :- عشق مجازی کی یہی منزل یعنی نفی سے اگر قلب آئینہ ہو جاتا ہے تو اس منزل میں پہونچ کر نگاہ پر پڑے ہوئے ظاہر کے پردے اٹھ جاتے ہیں ۔ ہر چیز

پہلے سے مختلف اور اصل رنگ میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ سچل سرمست نے اس کیفیت کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

بيرنگيءَ مون رنگ، پسو جو پيدا ٿيو،
ٻهير ۾ ٻيو رنگ، موسي ۾ فرعون جو.

(بے رنگی کے بعد جو رنگ نظر آتا ہے اس کا منظر ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ موسیٰ اور فرعون کا رنگ بھی بس ظاہری ہی الگ الگ ہے)

شاہ لطیف بھٹائی رح اپنے کردار سسی کی زبان میں فرماتے ہیں۔

پيهي جان پاڻ ۾ کيم روح رهاڻ،
ته نڪو ڏونگر ڏيهه ۾ نڪا ڪيچي ڪاڻ،
پنهون ٿيس پاڻ سسئي تان سور هئا.

(جب میں اپنے وجود کی دنیا میں کھو گئی تو میرا حقیقت مجھ پر روشن ہوگئی۔ اب نہ کہیں میری راہ میں پہاڑ حائل ہیں نہ ہی مجھے کسی کی تلاش ہے۔ اب میں خود ہی پنہل ہوں جب تک دوئی رہی درد فراق مجھے تڑپاتا رہا)۔

عشق کے اس درجہ کو "حال" بھی کہتے ہیں اس مقام پر سالک کو نہ صرف وحدت الوجود کا عرفان ہوتا ہے بلکہ وہ خود کو بھی ذاتِ حقیقی میں سمایا ہوا پاتا ہے۔ اسے "مرتبہ منصوری" بھی کہا گیا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر شاہ بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ نے نعرہ بلند کرتے ہیں :

سو ھي، سو ھو، سو اجل، سو الله،
سو ھر ين، سو پساھ، سو وبري، سو واھرو!

(وہی یار ہے۔ وہی دوست ہے وہی نفس ہے۔ وہی اجل ہے۔ وہی محبوب ہے۔ وہی زندگی ہے۔ وہی دشمن ہے اور وہی مددگار بھی۔ سب کچھ وہی ہے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے)

معرفت کی اس منزل پر کسی نے "بقا باللہ" کی نوید سنائی۔ کسی نے "اوتم" کا غلغلہ بلند کیا۔ کوئی "انا الحق" پکار اٹھا اور کوئی غائب کی طرح صرف یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفیٔ منصور نہیں

مگر جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے "لم تقولون مالا تفعلون" (ایسے اقوال سے کوئی فائدہ نہیں جن پر عمل نہ کیا جائے) عملی زندگی سے بے تعلق ہو کر ان منزلوں پر فائز ہونا یا حقیقت کی گہرائیوں تک جا پہونچنا زیادہ افضل بات نہیں۔ حق تو جب ادا ہو گا جب ان عظمتوں اور حقیقتوں کا عرفان عام کیا جائے اور دنیا کو اس کے فیض سے نکھارا اور سنوارا جائے۔ نہ اجتماعیت سے کنارہ کشی کی جائے نہ عمل سے۔ عمل کو نو عبادتوں میں سے افضل درجہ حاصل ہے۔ جملہ مذاہب اسی پر زور دیتے ہیں۔ اور جو لوگ رازِ حقیقت سے باخبر ہو جائیں انھیں تو اور بھی اس شعر کا پیکر بن جانا چاہئے

موجیم کہ آسودگیٔ ما عدمِ ماست
ما زندہ بہ آنیم کہ آرام نگیریم

اس لئے کہ بقول علامہ اقبال ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

حاصلِ کلام یہ ہے کہ تزکیہ نفس۔ سکونِ قلب اور عرفانِ حقیقت کا اعلیٰ ترین ذریعہ عشق۔ ہے اور افضل ترین عبادت خدمتِ خلق ہے آدمیت کا احترام اور انسانی معاشرہ کی امن و ترقی ہے۔

۴۔ شریعت یا فقہ

مذہب کا یہ صیغہ رسمی اور سماجی ضابطوں سے متعلق ہوتا ہے۔ جو مذاہب

تحریک کے بجائے محض روایت بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے شارحین دریافزہ میں بھی صدیوں پہلے کے رسمی و سماجی ضابطوں کو اپنانے پر زور دیتے ہیں بعض مذاہب کے مبلغین تو انھیں ضابطوں کی پیروی ہی کو اصل مذہب قرار دیتے ہیں۔

لیکن چونکہ انسانی معاشرہ اور اس کے تقاضے ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے ۔ زمانہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ آج کے دور کے حالات صدیوں پہلے کے حالات سے قطعی مختلف ہیں۔ ماضی کے بیشتر ضابطے اور قوانین حال کے لیے قطعی فرسودہ اور ناقابل عمل ہو چکے ہیں اس لیے ماضی پرست مذہبی مبلغین کی ہٹ دھرمیوں کے باوجود دنیا کے سارے ممالک اور ہر قوم نے وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق نئے قوانین بنائے ہیں یعنی کے مذہبی قوانین تاحین عملاً منسوخ ہو چکا ہے۔

آج کے ترقی یافتہ معاشرہ میں جو عیسائی بائبل کے عہد کے۔ ہندو منوسمرتی کے دور کے اور مسلمان اپنے ابتدائی زمانہ کے رسمی اور سماجی قوانین کے نفاذ پر اصرار کرتا ہے۔ یا تو وہ کم علم ہے اور نوشتہ دیوار پڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یا پھر اس آڑ میں اپنے لیے خاص فائدے حاصل کرنا چاہتا ہے اور اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو جان بوجھ کر دھوکہ دے رہا ہے۔

باب سوم

مذاہب کی کثرت اور وحدت

مذاہب پر اعتقاد رکھنے والے افراد نظریاتی اعتبار سے دو گروہوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ ایک گروہ مذاہب کی کثرت کا قائل ہے۔ اور ان کے ظاہری اختلافات کی اہمیت واضح کرنے پر زور دیتا ہے۔ دوسرا گروہ ظاہری اختلافات کو محض سطحی یا فروعی قرار دیتا ہے۔ ان کی بنیادوں میں وحدتِ مقصد تلاش کرتا ہے اور جملہ مذاہب کو اصلاً ایک تصور کرتا ہے۔ ان میں کون سا گروہ منفی فکر کا مظہر ہے۔ اور کون سا مثبت انداز فکر کا۔ کون سا گروہ خالقِ کائنات کی منشا پوری کرتا ہے اور کون سا اس کے برخلاف جاتا ہے۔ کس گروہ کا نظریہ بنی نوع انسان کی بہتری کے حق میں ہے اور کس گروہ کا نظریہ اس کے برعکس ہے؟ ان سوالات کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں ان دونوں متضاد نظریات کا ذرا تفصیلی جائزہ لینا ہوگا۔

کثرتِ مذاہب اور اختلافات پر زور دینے کا نظریہ :- جیسا کہ مذاہب کے تاریخی پس منظر کے باب کے مطالعہ سے واضح ہو چکا ہے، جملہ مذاہب کی بنیاد ان اوہام و عقاید، سماجی و اخلاقی ضابطوں اور عبادات و روایات پر استوار ہوتی ہیں کہ جو عہدِ قدیم کی وحشیانہ زندگی میں مختلف قبائل یا خطوں میں رائج رہی ہیں۔ مختلف قبائل اور خطوں میں جنم پانے والے مذاہب کی نشو و نما ایک دوسرے سے فطری طور پر مختلف رنگ میں ہوئی

یوں لاتعداد چھوٹے بڑے مذاہب وجود میں آئے۔ اب اگر ماضی کے ایسے کثیر مذاہب کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو بھی موجودہ دور میں ہمیں متعدد بڑے بڑے مذاہب ملتے ہیں۔ اور اگر ان مذاہب کے فرقوں کا شمار کیا جائے تو ان کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ چنانچہ ان واضح حقائق کے پیشِ نظر کثرتِ مذاہب اور ان کے ظاہری اختلافات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس کثرت اور اختلاف پر غور کرنے سے اس کے محرک یا پرورش کنندہ کی حیثیت سے ہمیں دو اہم رُجحانات نظر آتے ہیں۔ ایک ہے رجحانِ وحدت یا مرکزیت Integration or Centralization دوسرا رجحان ہے انفرادیت یا لامرکزیت۔ Dis-Integration or De-Centralization کا۔ دوسرے لفظوں میں ہم ان میں سے ایک کو "کُل" پسندی اور دوسرے کو "جزو" پسندی بھی کہہ سکتے ہیں۔

جس طرح سیاست میں بعض افراد وقتی نوع کے ذاتی یا گروہی مفادات کو اپنا مقصد بناتے ہیں۔ اور بعض اجتماعی اور مستقل مفادات کو ترجیح دیتے ہیں اسی طرح مذہب میں بھی بعض بزرگ چند رسمی حد بندیوں کو ہی سب کچھ قرار دیتے ہیں اور بعض ان میں سے بلند ہو کر انسانیت اور محبت کو۔ ان میں پہلا گروہ لامرکزیت کی طرف بڑھتا ہے اور دوسرا مرکزیت کی طرف، پہلا گروہ کثرتِ مذاہب یا تفرقہ کی تبلیغ کرتا ہے اور دوسرا گروہ وحدتِ مذاہب اور اتفاق کی۔ دوسرے گروہ کا ذکر آئندہ صفحات پر کیا جائیگا۔ یہاں میں صرف کثرتِ مذاہب کی وجوہات اور ان کے نتائج کا تجزیہ پیش کروں گا۔

چونکہ مذہبی جماعتیں ابتداء میں رضاکارانہ طور پر چند مخصوص عقیدوں۔ رسومات اور اخلاقی و سماجی ضابطوں کی بنیادوں پر قائم کی جاتی ہیں۔ اس لئے ہر ایک مذہبی جماعت کی تنظیم۔ ترقی اور استحکام کی خاطر مندرجہ ذیل باتوں پر انحصار کیا جاتا ہے:

۱۔ مذاہب کے بانیوں اور ان کے جانشینوں کو مافوق البشر قرار دے کر ان کے ہر قول و فعل کی پیروی کرنا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔

۲۔ ان کی تعلیمات و ہدایات کو فوق العقل اور الہامی جان کر ان کی ابدیت اور صداقت پر ایمان رکھنا لازمی خیال کیا جاتا ہے۔

۳۔ ان کے پیش کیے ہوئے سماجی اور شریعتی ضابطوں کی پابندی کو ذریعہ نجات تصور کیا جاتا ہے۔

۴۔ اپنے مذہب کو دنیا و آخرت کا واحد "مذہبِ حق" تصور کرنا اور سارے مذاہب کو مذاہبِ باطل قرار دینا لازمی سمجھا جاتا ہے۔

ان باتوں پر زور دینے کی وجہ سے ہر مذہبی جماعت اپنے اعتقادات اور سماجی و اخلاقی ضابطوں کی پرستار ہو کر رہ گئی ہے اور مذہبی گروہ مستقل مفادی گروہ Vested Interest کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اس صورتِ حال میں مذاہب اور فرقوں کا وجود میں آنا اور ان کا قائم رہنا ایک فطری بات ہوتی ہے۔ اور یوں "کس نمی گوید کہ دوغ من ترش است" والا معاملہ درپیش ہوتا ہے۔

بہر حال جس طرح لوگوں کی سہولت اور شناخت کے لیئے دنیا کے مختلف براعظموں، ملکوں، صوبوں ضلعوں اور تحصیلوں کی تقسیم ضروری ہے۔ اسی طرح نظریات کی دنیا میں مذاہب اور فرقوں کا وجود بھی لازمی اور فطری ہے۔ جس طرح آج دنیا کی ہر قوم کے لیئے بین الاقوامی طور پر حقِ خود ارادی تسلیم کیا جاتا ہے اسی طرح رواداری کے ساتھ جملہ مذہبی شریعتوں، عقیدوں اور عبادتوں کی آزادی کو بھی تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ ہر عقیدہ و خیال کے لوگوں کو یہ حق دیا جانا چاہیئے کہ وہ اپنی روایات کو بہتر سمجھیں اور اپنی پسند کے مطابق عبادت و معاشرت اختیار کریں۔ محض عقاید و عبادات کا اختلاف انسانی معاشرہ میں کسی افراتفری یا شر و فساد کا سبب نہیں بنتا۔ بدامنی صرف اس صورت میں پیدا ہوتی ہے جب کسی مذہب و عقیدہ کے لوگ دوسروں کو اپنا پیرو یا زیردست بنانا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس کے لیے طاقت اور تشدد کے استعمال کو ثواب قرار دیتے ہیں۔ یہ فکر مذاہب کی اصل غایت کو پسِ پشت ڈال دیتی ہے اور مذہبی گروہ بالآخر استعمالِ غرض Exploitation پر اتر آتے ہیں۔

بعض لوگ جہاد کا
طاقت اور تشدد کے ذریعہ دوسروں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کو
بھی نام دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات اسلام کے قطعی منافی ہے۔ قرآن پاک میں واضح طور پر
"لااکراہ فی الدین" (دین کے معاملے میں جبر جائز نہیں ہے) اسی سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ ایک
اور مقام پر اس ہدایت کی تشریح "لکم دینکم ولی دین" (تمہارا دین تمہارے لئے اور
میرا دین میرے لئے) کہہ کر بھی کردی گئی ہے۔ اختلاف رائے و عقاید کے بارے میں رواداری
اختیار کرنے کی تلقین جس اہمیت کے ساتھ اسلام میں کی گئی ہے۔ اہل علم کے لئے اس سے
انکار ناممکن ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور قول "اختلاف امتی رحمت" اور کلام پاک
کا ارشاد "لکم قوم ہاد" (ہر قوم یا گروہ کے لئے اس کی اپنی ہدایات ہیں) اس دعوے کے ثبوت
کے لئے کافی ہیں۔

رواداری کی صورت میں مذاہب کی کثرت باغ عالم کو رنگا رنگی پھولوں کی حیثیت
سے مزید دلکش بنا دیتی ہے۔ جن کی خوشبو سے اپنے اپنے ذوق کے مطابق سارے انسان کیف
اندوز ہوتے ہیں۔ اور تنگ نظری اور تعصب کی صورت میں کوئی ایک ہی قسم کا پھول نہیں
سارا باغ تباہی کے خطرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اسلام کو صحیح طور سے سمجھنے والا مسلمان خالق دو جہاں کی پیدا کردہ کسی شے کو حقیر
اور بیکار نہیں سمجھتا اور ہر شے سے مفید اور کارآمد مواد حاصل کرتا ہے۔ انسان کو رب دو جہاں
کا ارضی نمائندہ اور اشرف المخلوقات سمجھنے والا مومن ان حقائق سے روگردانی نہیں کرتا کہ

۱۔ مذاہب انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں نہ کہ انسان مذاہب کے لئے۔
۲۔ دنیا کے جملہ عقاید، نظریات، فلسفوں، سائنسوں اور علوم سے لائبریری کی طرح
استفادہ کرنا چاہئے۔ اور ان میں سے "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے مصداق
مفید باتیں اختیار کرنی چاہئیں اور غیر مفید باتیں ترک کردینی چاہئیں۔
۳۔ کوئی بھی خیال، نظریہ، عقیدہ ازرمنہ ہر صورت میں اٹل اور ہر دور کے لئے جوں
کا توں مفید نہیں ہو سکتا۔ دین فطرت قانون ارتقاء کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔
اسے محدود و مسدود نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو آگے بڑھتا ہوا سلسلہ ہے جس کی

انتہا نہیں متر رکی جا سکتی۔ بقول شاہ لطیف بھٹائیؒ۔

جي قيام مڙن تہ بہ ويجها ڀانئج سپرين

(یعنی اگر یوم آخرت تک بھی تم حدِ تمنا کو پالو تو سمجھنا کہ مطلوب جلد ہی مل گیا)

غرض جو بھی مذہب، نظریہ، فلسفہ یا عقیدہ بنی نوعِ انسان کے امن و اتحاد اور ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے وہ غیر فطری یا منشائے ایزدی کے خلاف ہو جاتا ہے۔

وحدتِ مذاہب کا نظریہ:- جیسا کہ میں نے اس سے پیشتر ذکر کیا ہے دنیا کے مختلف ادوار اور ممالک و اقوام میں ایسے لوگ بھی ہوتے آئے ہیں۔ جنھوں نے ہر قسم کے تعصبات و امتیازات سے بالاتر ہو کر بنی نوع انسان کی یکجہتی اور ترقی کے لیے کوششیں کی ہیں۔ ان حقیقت شناس لوگوں نے موجوداتِ کائنات اور ان کے ماضی حال اور مستقبل پر غور کیا ہے۔ انسانی جسم ذہن اور معاشرہ کے ارتقار کو سمجھا ہے اور مذاہب و عقاید کی ظاہری کثرت کی اوٹ میں بنیادی وحدت کارفرما دیکھی ہے۔ اس عظیم سچائیؑ کے عرفان اور اظہار کے لیے دو طرح کے ذرائع اختیار کیے گئے ہیں۔ ایک سینہ بہ سینہ تعلیم کا ذریعہ دوسرا قیاس اور سائنسی تحقیق کا ذریعہ۔

۱۔ **سینہ بہ سینہ تعلیم کا ذریعہ:-** یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی زمانہ میں بھی سارے ہی لوگ ایک جیسے ذہن کے مالک نہیں ہوتے۔ کچھ مہذب راسخ العلم اور صاحبِ دل ہوتے ہیں تو کچھ غیر مہذب۔ جاہل اور متعصب۔ دوسری قسم کے لوگوں کی ہمیشہ سے اکثریت رہی ہے۔ جبکہ پہلی قسم کے لوگوں کی تعداد اتنی ہی رہتی آئی ہے کہ انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست" کے مطابق مذہبی عقاید۔ سماجی و اخلاقی ضابطوں اور زندگی کے بارے میں ان دو گروہوں کے زاویہ ہائے نگاہ ایک دوسرے سے مختلف رہے ہیں۔ ایک نے فروعی اور عارضی مفاد کی باتوں کو دین و ایمان بنایا دوسرے نے بنیادی اصولی اور دائمی باتوں پر توجہ دی۔ ایک گروہ نے صرف حال کو سامنے رکھا اور دوسرے گروہ نے مستقبل کو۔

پیغمبرانِ دین کی بھی بعض تعلیمات و ہدایات عام لوگوں کے لیے ہیں اور بعض خواص

کے لیے۔ خواص (صاحبِ فہم) کے لیے کہی گئی باتیں عوام (نافہم) کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ فکروفہم کی اس تفریق کی بنا پر دونوں کے مذہبی تصورات اور عقیدے نیز فرائض اور ذمہ داریاں جُدا قسم کی ہوتی ہیں۔

اب چونکہ مذاہب اور ان کے فرقے کچھ مدت بعد ایک مفادی گروہ کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اس لیے ان کے قائدین یا شارحین کے مفادات کا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ سب لوگ ان کے زیرِ اقتدار ہی رہیں۔ مفادی اقتدار قائم رکھنے کی اس کوشش میں ہم عقیدہ حکمراں گروہ مذہبی قائدین اور سرمایہ دار طبقہ سب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور ان کے مفادات مشترک ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی کوئی بھی بات برداشت نہیں کرتے ہیں جس سے لوگوں میں رواداری پیدا ہوتی ہو اور توہمات و تعصبات کے وہ پردے چاک ہوتے ہوں جنھیں وہ جان بوجھ کر لوگوں کی نگاہوں پر چڑھائے رکھتے ہیں اور اپنے مفادات کی حفاظت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انہی پردوں پر اشتعال کی چنگاریاں پھینک کر وہ حق گو اور عوام کے سچے خیر خواہ لوگوں کے خلاف جذبات کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ اور انھیں من مانی عقوبتوں کا شکار بناتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وحدتِ انسانی یا وحدتِ مذاہب کا عرفان حاصل کرنے والے اہل اللہ درویشوں نے یہ کمال سینہ بہ سینہ ایک سے دوسرے میں منتقل کیا اور اسے علی الاعلان اور عوام کی ذہنی سطح کے مطابق کھول کر بیان کرنے سے احتیاط برتی۔ ان بزرگوں کو ہم دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک گروہِ سالکین اور دوسرا گروہِ مجذوبین۔

گروہِ سالکین :- اس گروہ کے بزرگوں نے اپنے خیالات اشاروں اور کنایوں میں ظاہر کیے ہیں یعنی حالات کے مطابق انھوں نے ایسا پیرایہ بیان اختیار کیا ہے کہ عوام کے تعصبات بھی مشتعل نہ ہوں اور اہلِ فہم اس سے گوہرِ مراد بھی پالیں۔ چنانچہ اسی کیفیت کی ترجمانی میں مولانا روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

خواجہ حافظ اس بات کو اپنے رنگ میں یوں کہتے ہیں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز
ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

گروہِ سالکین اس صورتِ حال کا پورا احساس رکھتا تھا کہ مفادی گروہ کی دہشت گردی اور اقتدار کے پیدا کردہ تعصبات باطل اور انسانیت کے لیے مضر ہیں لیکن ایک جانب ان کا اثر و رسوخ معاشرہ پر چھایا ہوا ہے دوسری طرف عوام الناس کے اذہان ان کی گرفت میں ہونے کی وجہ سے وسعت اور برداشت سے محروم ہیں۔ ایسی حالت میں وہ بالکل خاموش تو نہ رہ سکتے تھے مگر کھلے لفظوں میں اپنی بات بھی نہ کہہ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس مقولہ پر عمل کرنا مناسب سمجھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ قدم قدم پر انھیں مفادی گروہ کے ظلم و استبداد کا خطرہ تھا چنانچہ اپنی تعلیم کو انھوں نے سینہ بہ سینہ پھیلایا اور گفتگو کا وہ طریقہ اختیار کیا کہ بات بھی کہہ دی جائے اور مفادی گروہ کی انتقامی اور تادیبی کارروائیوں سے بھی محفوظ رہا جائے۔

گروہِ مجذوبین :- یہ ایسے لوگ تھے جن پر ہوش سے زیادہ جوش کا اثر تھا۔ انھوں نے حق کو ڈنکے کی چوٹ اور بے خوف و خطر ظاہر کیا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کی تعلیمات سے مذہبی توہمات اور تنگ نظری کی جڑیں کھوکھلی ہوں گی جس کی وجہ سے مفاد پرست گروہ کا غیظ و غضب جوش میں آئے گا۔ اس کے باوجود وہ اپنے مشن کی صداقت اور عوام کی فطری حق پسندی پر اعتماد رکھتے تھے۔ اگرچہ عوام میں تجزیہ کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ بھانت بھانت کی بولیوں میں صحیح اور سچی بات کا انتخاب کرنے میں انھیں دیر لگتی ہے۔ لیکن اس کا سبب ان کی سادہ لوحی اور حافظہ کی کمزوری ہوتی ہے۔ ان کے قلب بہرحال سالم اور حساس ہوتے ہیں۔ مجذوبین کو یقین ہوتا تھا کہ اگر وہ ان کی بات پر فی الفور کان نہ دھریں گے تو بھی جب مفاد پرست فقہا اور حکام ان کے اعلانِ حق سے خائف ہو کر ان کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائیں گے تو اس پر عوام ضرور چونکیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ کھلم کھلا اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے تھے اور مفاد پرست گروہ کی جانب سے کی جانے والی سختیوں اور عقوبتوں کو نہ صرف

خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے بلکہ تادیب و سزا کے ان رجحانات کو ناکام ثابت کر دکھاتے
تھے۔ غالب نے ایسے ہی لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے کار محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

یہ مجاہدانہ اور غازیانہ روش اپنانا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں حافظ شیرازی اس
مسلک پر چلنے والوں کو ہوشیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے
شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

بلاشبہ اس راہ پر گامزن ہونے والے کے لیے مجنوں یا اپنے حال و انجام سے
بیگانہ ہونا پہلی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ
لوگ دیوانہ سمجھ کر ان سے درگزر کرتے رہیں گے۔ مفاد پرست گروہ محض انھیں سزا دینے
یا دولانے پر ہی قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی جان و آزادی کے بھی درپے ہو جاتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ مجذوب میں وقت کے زیادہ سے زیادہ استعمال کے لیے تڑپ ہوتی ہے۔
مستقبل کے انتظار میں وہ حال کو خاموشی کے ساتھ گنوانے پر آمادہ نہیں ہوتا اور انقلابی
تیور اپناتا ہے۔ بقولِ حافظ ؎

دم فرصت غنیمت دان و داد خوش دلی بستان
بسے گردش کند گردوں بسے لیل و نہار آرد

مجذوب کو جو لمحہ بھی میسر آتا ہے غنیمت جان کر حق کی بے دریغ تبلیغ کرتا ہے۔
وہ اس احساس سے غافل نہیں ہوتا کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔

اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ کون سی تعلیمات تھیں جن کی سالکین نے اشاروں
کنایوں میں اور مجذوبین نے علی الاعلان تلقین کی اور جن کی وجہ سے بیشتر مذہبی
سربراہوں اور اہلِ اقتدار کے مفادات کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا؟ میری رائے میں
اس قسم کی تعلیمات کا نچوڑ یہ تھا کہ ''فقط ذاتِ حقیقی ہی اصل وجود ہے اس کے

ماسوا کہیں بھی کچھ نہیں ہے۔ دیگر سارے مظاہر صرف اس کی صفات ہیں "۔
شاہ لطیف بھٹائی علیہ الرحمتہ اس بات کو اپنے لفظوں میں یوں واضح کرتے ہیں۔

عاشق چو مَ ان کي، مَ کي چو معشوق،
خالق چو مَ خام تون مَ کي چو مخلوق،
ــلبج تهن سلوک، جـو نـاقصاني نگيو.

"وہ نہ عاشق ہے نہ معشوق۔ نہ خالق ہے نہ مخلوق۔ یہ سالکانہ رموز ہیں اور ناقص دلوں کی فہم سے بالاتر باتیں ہیں "۔

بادی النظر میں یہ بات بڑی سادہ سی ہے مگر اس پر صدق دل سے اعتقاد کیا جائے تو ہر شے ایک ہی ذاتِ واحد کا پرتو محسوس ہونے لگتی ہے۔ خالق و مخلوق کی دوئی مٹ جاتی ہے۔ مذہب، رنگ، نسل۔ قوم اور وطن وغیرہ کے امتیازات سے قطع نظر کل بنی نوع انسان ایک ہی جسم کے مختلف اعضا قرار پاتے ہیں۔ نفرت و تعصب اور نفاق و عداوت قائم رکھنے کی ساری دلیلیں باطل ٹھہرتی ہیں۔ مذہبی حد بندیوں اور تعصبات نیز جزا و سزا اور بہشت و دوزخ کے تصورات ماند پڑجاتے ہیں۔ اور چونکہ پیشہ ور مذہبی سربراہوں اور اقتدار پرستوں کا کاروبار ان عقائد کے فروغ سے خطرہ میں پڑجاتا ہے اس لئے وہ ایسی تعلیمات کو مذہب و اقتدار کی کھلی اور ناقابل معافی بغاوت قرار دیتے تھے۔

معرفت کی یہ باتیں اہل دل اور صاحبِ نظر بزرگوں ہی تک محدود تھیں۔ مسلمانوں میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رازوں کا علم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ہوا۔ جن سے طریقت کے مختلف سلسلے جاری ہوئے۔ مشہور حدیث " انا مدینۃ العلم وعلیؓ بابہا " (میں شہر علم ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں) اسی حقیقت کی غماز ہے۔

دراصل اس مسلک کا اصول بھی یہی ہے۔ اس میں حقیقتوں اور رازوں کا علم گرو یا مرشد سے سینہ بہ سینہ چلتا ہے اور ان کا عرفان صحبت علم اور عشق کے فیض سے ہوتا ہے۔ اہل علم میں سے ویدانتیوں، پینتھسٹوں Pantheists اور

وحدت الوجودیوں نے اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مغرب کے قدما میں افلاطون (Plato) اور دورِ جدید میں اسپنوزا Spinoza اور نو فلاطونیوں Neo Platonists اور بعض دوسرے علماء نے اس مسئلہ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مشرق میں رام کرشن مٹھ کے سوامی وویکانند اور دیگر افراد نے اور مسلمانوں میں شیخ الاکبر محی الدین ابنِ عربی نے اس نظریہ کو فلسفیانہ طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرمد، شاہ عنایت، بچل سرمست وغیرہم اس مسلک کے ممتاز مبلغین و سالکین میں سے ہیں۔ دیگر مذاہب بھی ایسے بزرگوں کے وجود سے خالی نہیں ہیں۔

یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ جملہ عاشقانِ حقیقت اور سالکانِ طریقت ادیان اور دھرموں کے تعصبات اور نوعِ انسانی کو مذہبی تفریق کے نام پر ایک دوسرے سے متنفر کرنے کے خلاف رہے ہیں۔ چونکہ اس سے مذہبی سربراہوں اور اقتدار پرست طبقہ کی اجارہ داریوں کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان کی جانب سے ایسے بزرگوں کی تعلیمات کے خلاف ہر طرح کا حربہ استعمال کیا گیا۔

مسلمانوں میں امام غزالی اور مجدد الف ثانی نے نظامِ شریعت کے جواز میں فلسفیانہ دلائل پیش کئے ہیں۔ ہندوؤں میں آریہ سماج کے عالموں نے "آریائی سبھیتا" پر زور دیا ہے۔ اور عیسائیوں میں اصلاح Reformation اور نشاتِ ثانیہ Renascence کی تحریکیں پیدا ہوئیں۔

یہاں طوالت سے بچنے کے لئے میں ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ ذکر کرنے کے بجائے صرف مسلمانوں کی وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی تحریکوں پر روشنی ڈالوں گا۔ اس سے دیگر مذاہب کی اسی قسم کی متضاد تحریکوں کا بھی اندازہ کیا جا سکے گا۔

وحدت الوجود :- مسلمانوں میں اس نظریہ کے بانی شیخ محی الدین بن علی ابنِ عربی تھے۔ وہ "شیخ الاکبر" کے لقب سے مشہور ہیں۔ وہ ۵۶۵ھ مطابق ۱۱۶۴ء میں جنوبی اسپین کے شہر مورسیا میں پیدا ہوئے۔

کیا جاتا ہے کہ وہ حاتم طائی کی اولاد میں سے تھے ۔ ۵۸۶ھ میں انھوں نے پرتگال کے
دارالحکومت لزبن میں شیخ ابوبکر بن خذاف کی شاگردی اختیار کرکے ابتدائی تعلیم کا آغاز
کیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مشرقی اسپین کا گورنر سلطان محمد تھا ۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے
بعد ابن عربی سیوطی چلے گئے ۔ وہاں کارڈووا میں کچھ عرصہ رہ کر انھوں نے مزید تعلیم
حاصل کی اس کے بعد وہ مراکو کے شہر فیض چلے گئے ۔ وہاں سے مصر کے شہر اسکندریہ
پہونچے اور آخر میں شام کے شہر دمشق میں جا کر مقیم ہوگئے ۔ ۶۳۸ھ مطابق ۱۲۴۰ء
میں وہیں انھوں نے وفات پائی ۔ اور "جبل قاسیون" پر قاضی محی الدین کے قبرستان میں
دفن ہوئے ۔

اسلامی تصوّف میں وحدت الوجود کے نظریہ کی فلسفیانہ شرح وبسط انھوں
نے ہی پیش کی جس کے بعد اس نظریہ کی تعلیمات رفتہ رفتہ سارے اسلامی ممالک میں
پھیل گئیں ۔ تاہم یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس سے پیشتر یہ نظریہ وجود ہی نہ رکھتا تھا ۔
بزرگانِ طریقت کا عقیدہ ہے کہ اس نظریہ کی تعلیمات آنحضرت صلعم سے حضرت علی کو اور
ان سے مختلف بزرگوں کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی آئی ہیں ۔ منصور حلاج شمس تبریز ۔
خواجہ فریدالدین عطار وغیرہم نے انہی تعلیمات کی قدرے کھل کر تبلیغ کی ہے ۔ البتہ فلسفیانہ
طور پر اس نظریئے کی توضیح وتشریح کرنے کا سہرا بے شک ابن عربی کے سر ہے ۔ ان کی
مشہور کتاب "فصوص الحکم" اس سلسلہ میں خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہے ۔

وحدت الوجود کے نظریہ کو نظریۂ ہمہ اوست بھی کہا جاتا ہے ۔ جس کا مطلب
یہ ہے کہ "حقیقی وجود صرف ہستیٔ مطلق یا وجودِ کل کا ہے" ۔ یہ وجودِ کُل ہی خدا ہے ۔ اس
کے سوا کہیں بھی کوئی اور چیز وجود نہیں رکھتی ۔ کائنات محض اس کے پرتو کا مظہر یا عکس
ہے جسے عالمِ صفات کہا جاتا ہے ۔ اور وہ اس سے الگ کوئی وجود نہیں ۔ اس نظریہ
کے پیروؤں کا بنیادی نعرہ بھی "لاموجود الا اللہ" (کوئی شے موجود نہیں سوائے اللہ
کے) ہے ۔

جس طرح آئینہ میں آدمی کا عکس، زمین پر اس کا سایہ یا گردو پیش میں اس کی

آواز کی گونج اس کی الگ کوئی مجرد وجود نہیں رکھتی۔ اسی طرح صفات مظہری بھی کوئی مختلف چیزیں نہیں ہیں اور ذاتِ حقیقی کی تکرار یا عکس کی مانند ہیں۔

اس نظریہ کا رسمی مذہب اور سیاسیات پر جو اثر پڑتا ہے۔ اس کا مختصر ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ چونکہ اس نظریہ کے مطابق ہر شے کی اصلیت ایک ہی ہے۔ اس لئے اس کے پیرو نفرت و نفاق کے بجائے انسانی معاملات میں محبت و اتحاد کی پالیسی کو اپناتے ہیں، اور کثرتِ ظاہری کے پس منظر میں چھپے ہوئے رازِ وحدت کو فاش کرتے ہیں۔ اس طرز عمل سے مذہبی تعصبات کی بنا پر انسانوں کی تقسیم، تفریق اور لوٹ کھسوٹ کو مباح قرار دینے والے عقاید کی بیخ کنی ہوتی ہے جس کی وجہ سے پیشہ ور مذہبی شارحین اور ان کے معاون اقتدار و استحصال پسند گروہ تلملا اٹھتے ہیں اور اپنے ناجائز مفادات کو خطرہ میں دیکھ کر وحدت پرستوں کی آواز دبانے کے لئے ہر قسم کے ہتھکنڈے اختیار کرنے پر اتر آتے ہیں۔ وحدت پرستوں کی تعلیمات کے انداز میں انتہاپسندی یا اعتدال ہونے نہ ہونے کا انحصار مذہبی شارحین کے رویہ پر رہا ہے۔ جب کبھی پیشہ ور اور مفادی مذہبی گروہ نے مذہبی جذبات سے حد سے زیادہ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور تعصب و تنگ نظری کے رجحانات کو عام کرنے کی روش اپنائی ہے تو ایسے مواقع پر جوابی کارروائی کے طور پر وحدت الوجود کے پیروؤں نے بھی انتہاپسندانہ لب و لہجہ اختیار کرنا ضروری خیال کیا ہے ایک اردو شاعر نے ایسے ہی موقع پر کہا ہے ؎

بت خانہ کھود ڈالئے مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیئے یہ خدا کا مقام ہے

عبدالحمید عدم اسی جذبہ کی نمائندگی کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

جی خوش ہوا ہے مسجدِ ویراں کو دیکھ کر
میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے

اور منصور سندھ حضرت سچل سرمست نے علماءِ ظاہر کی متعصبانہ اور تنگ نظرانہ روش سے تنگ آکر فرمایا جڏهان منبر، مسجد، مناري، ويران نه ٿيس، حال حقاني ميان منجو حاصل نہ ٿيوي.

نظریۂ وحدت الشہود :- اس نظریہ کا دوسرا نام "ہمہ از اوست" ہے۔ اس
کے مطابق کل موجودات کائنات کا خالق خدا (God) ہے۔ ہستی مطلق
ذات خدا ہے۔ اور مخلوقات سے الگ پاک اور اعلیٰ ہے۔ عالم صفات کو اس کے
وجود سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ روح مطلق اور مادہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔
یہ نظریہ پہلے تو خیر و شر ثواب و گناہ اور جزا و سزا کے داخلی احتسابی عقاید
میں ڈھلتا ہے لیکن پھر آگے چل کر کفر و ایمان کے اجتماعی تصورات میں شدت
پیدا کر کے سماجی و سیاسی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مذہبی ادارے لوگوں کو
"گمراہی" سے نکال کر "راہِ حق" پر چلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس کے لیے تبلیغ
سے لے کر تلوار تک ہر چیز کے استعمال کو جائز اور ثواب تصوّر کرتے ہیں۔ وحدتِ
کل ان کے تئیں واہمہ اور مظاہر کثرت انکے نزدیک اصل حقیقت ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد
پر وہ اعلیٰ و ادنیٰ اور اپنے پرائے کے امتیازات کو اپناتے ہیں۔

جہاں تک ہم عقیدہ اور ہم خیال افراد کے گرد ہوں یا جمیعتوں کے اندر اس
عقیدہ کی تنظیمی اہمیت کا تعلق ہے بلاشبہ بڑی حد تک یہ مفید ثابت ہوتا ہے
لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس عقیدہ کے تصوّرات صرف اپنے دائرہ کی تنظیم کی حد تک
محدود نہیں رہتے۔ مزید آگے بڑھ کر وہ انسانی معاشرہ میں انتشار و تفرقے کا سبب
بنتے ہیں۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ ایک منزل کے بعد یہ نظریہ انتہا پسندی کا شکار
ہو جاتا ہے ایسے یا اس سے ملتے جلتے نظریات کی وجہ سے مختلف مذاہب، نسلوں
اور ملکوں کے افراد کے مابین فرقہ بندیاں متعصبانہ قوانین و ضابطے و تشدد کے
واقعات رونما ہوئے ہیں اور اسی کی اندھی تقلید کی وجہ فسطائی خیالات کے لوگوں اور حکومتوں
نے دنیا کا امن و امان برباد کیا ہے۔ اس نظریہ کے عروج سے آزادیٔ رائے۔ آزادیٔ
ضمیر، جمہوریت اور وسیع النظری کی تحریکوں کو شدید نقصان پہونچا ہے۔ اس سے افراد
اور اقوام میں کمتری و برتری اور اونچ نیچ کے امتیازات پیدا ہوئے ہیں۔

جہاں تک میری رائے ہے انسانی معاشرہ کو ان دونوں ہی نظریوں کی انتہا پسندی
نے کافی پیچھے دھکیلا ہے۔ وحدت الوجود سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس مسلک کی

کتابوں کے علاوہ یوگ وششٹ۔ گیتا۔ سوامی ویویکانند اور سوامی رام تیرتھ کے خطبات۔ افلاطون۔ اسپنوزا، اور نوفلاطونیوں کی تصنیفات بھی دیکھنی چاہئیں۔

۲۔ **قیاسی اور سائنسی تحقیق کا ذریعہ** :- مذاہب کے تاریخی تجزیہ کے باب میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ان کی شروعات کس طرح ہوئی کس طرح وہ بتدریج حالات کے تقاضوں، معاشرہ کی تبدیلیوں اور معلومات سے متاثر ہوکر اپنے عقاید۔ رسم ورواج اور دستور وضابطوں میں تغیر و تبدل کرتے آئے۔ انہی ارتقائی منزلوں کی تحقیق سے سائنسی علوم کے ماہرین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خوف اور امید کی وجہ سے پیدا ہونے والے عقاید اور ضابطے درجہ بدرجہ آگے بڑھتے آئے ہیں۔ اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ طب کیمیا، اور علم الحیات کی طرح وہ مذہب کو بھی سماجی اور ذہنی ارتقاء کا ایک علم تصور کرتے ہیں۔ جو باوجود مختلف عقاید اور ضابطوں میں تقسیم ہونے کے بنیادی وحدت رکھتا ہے اور مسلسل ترقی پذیر رہے۔ جس طرح دوسرے علوم کے قایم کردہ بعض نظریات یا کلیئے تجربات اور افادیت کی کسوٹیوں پر پرکھنے کے بعد رد و قبول کئے جاتے رہے ہیں۔ اسی طرح مذہب کے نظریات و عقاید میں بھی ترمیم و تنسیخ جاری رہتی آئی ہے اور رہے گی۔ کسی بھی مذہب کا اعتقادی نظریہ اور سماجی دستور دائمی اور آخری نہیں ہے۔ قانون ارتقاء کے مطابق ہر ایک میں تبدیلی اور ترقی ہوتی رہتی ہے۔

اہلِ طریقت کے خیال کے مطابق اسلام بھی دین فطرت یا ترقی پذیر تبدیلی کا قانون ہے۔ حالات و زمانہ کے تقاضوں کے مطابق یہ ہمیشہ نئی راہیں پیش کرتا رہتا ہے۔ اس کے بنیادی اور اٹل اصول اتحاد انسانی، امنِ عالم اور ترقی بنی آدم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا لقب رحمت اللعالمین اور اہل اسلام کا خدا رب العالمین ہے جن کا لطف و کرم ساری دنیا کے لئے یکساں ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے "ان الذین آمنو، والذین ھادو، والنصاریٰ، والصابئین من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون"، (جو لوگ

ایمان لائے ہیں [یعنی مسلمان ہوتے ہیں] اور جو لوگ یہودی یا نصارا یا دیگر مذاہب کے پیرو ہیں اور اللہ پر اور آخرت [یعنی بنی آدم کے ترقی پذیر مستقبل] پر ایمان رکھتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں ان سب کو خدا کی طرف سے انعام ملے گا اور وہ نجات پائیں گے]۔

اس واضح قرآنی بشارت کے باوجود، صرف چند افراد یا مخصوص فرقہ یا محض کسی ایک مذہب کے پیرووں کو نجات اور دائمی خوشی کا حقدار جاننا، جن میں غاصب، زانی، ظالم، راشی، اور ضمیر فروش لوگ بھی شامل ہوتے ہیں، دینِ فطرت کے فیصلہ کے خلاف ہے۔ اہلِ طریقت نیز سائنسی علوم کے ماہرین کی رائے کے مطابق دینِ حق ابتدا سے ابتک ایک ہی رہا ہے۔ اور رہے گا۔ اس کی مختلف تشریحات و صورتیں محض اس کی ظاہری نوعیتیں ہیں۔ جس طرح سے رنگارنگی پھول باغ کا حسن دوبالا کرتے ہیں اسی طرح سے مختلف نظریات و عقائد کے غیر متشددانہ گل بوٹے باغ علم کی رونق میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔ اس کا فیصلہ ہر شخص کے ذوق پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ کس خاص گل کو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ نہ کسی کو اس باغ کی اجارہ داری کے دعوے کا حق ہونا چاہئے نہ کسی کو کسی کی پسند پر معترض ہونا چاہیے۔ سارا باغ بنی نوع انسان کی مشترکہ ملکیت و میراث ہے اس میں استفادہ کے حق سے کسی کو محروم نہیں کیا جا سکتا۔

سوال پیدا ہوگا کہ ان دونوں متضاد و متحارب نظریوں یعنی وحدتِ مذاہب اور کثرتِ مذاہب کے عقیدوں کا ٹکراؤ کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ تاحال اس سلسلہ میں دو طرح کی کوشش کی گئی ہیں۔ ایک کوشش مثبت انداز کی اور دوسری منفی انداز کی یعنی بعض نے جملہ مذاہب کی اچھی اچھی باتوں کو اپنانے کی تلقین کی ہے۔ اور بعض نے اپنے فرقہ یا مذہب کو عالمگیر طور پر قبول کرانے پر زور دیا ہے۔

تاریخی تجربات کی کسوٹی پر یہ دونوں طرح کی کوششیں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ گرو نانک۔ بھگت کبیر۔ صوفیائے کرام۔ راجہ رام موہن رائے وغیرہم کی جانب سے اس سلسلہ میں کی گئی کوششیں مزید فرقہ بندیوں کا سبب بنی ہیں۔ دوسری طرف بڑے بڑے مذاہب

جن میں بدھ مت ۔ عیسائیت ۔ ہندو مت اور اسلام شامل ہیں کروڑہا افراد کو اپنا پیرو بنانے اور بین الاقوامی مذہب کی حیثیت اختیار کر جانے کے باوجود نہ کل بنی نوع انسان کو متحد کر سکے ہیں نہ تعصبات و اختلافات کی بیخ کنی کر سکے ہیں ۔ یہ بات سوچنا کہ آگے چل کر کبھی ساری دنیا کے لوگ ان میں سے کسی ایک مذہب کے دائرہ میں شامل ہو جائیں گے خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔ مذاہب کے پھیلاؤ کا ذریعہ طاقت ، تبلیغ اور نسلی اضافہ رہا ہے ۔ آج دنیا میں ایسا کوئی مذہب نہیں جو ایسی طاقت یا ایسا پرکشش اور زبردست تبلیغی منصوبہ رکھتا ہو کہ سنجیدگی کے ساتھ کل بنی نوع انسان کا واحد مذہب بن جانے کی سوچے ۔ کسی بھی مذہب کی اب جو کچھ بھی ترقی ممکن ہے وہ صرف نسلی اضافہ کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے لیکن اس کی بھی بہر حال ایک حد ہے اور قابل ذکر اہمیت صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ایک مذہب کے سارے ماننے والے ایک ہی جیسا سیاسی اور اقتصادی نظام اپنا لیں یا ایک ہی قیادت کے تحت سماجی طور پر منظم ہو جائیں ۔ لیکن کم از کم بین الاقوامی مذاہب کے لئے نہ یہ بات ممکن رہی ہے اور نہ آئندہ ممکن ہو سکتی ہے ۔

ان حالات میں انسانی امن و اتحاد اور بہبود و ترقی کی راہیں ہموار کرنے کا ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے بقائے باہمی Co-existence کے اصول پر اعتقاد و عمل کا طریقہ ۔ یعنی منظم ادیان Institutionalised Religions استحصالی مفادات Vested Interests سے دستکشی اختیار کی جائے ۔ مذہب کو انفرادی حق کے طور پر تسلیم کیا جائے ۔ دوسروں کے عقائد و نظریات کا احترام کیا جائے ۔ تنگ نظری اور تعصب کو خیر باد کہا جائے اور انسانی امن و ترقی کی خاطر کھلے دل سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا جائے ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

بابِ چہارم

اسلام کی دو تعبیریں

مولانا ابوالکلام آزاد سرمد شہید کی سوانح حیات کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

" ایشیا میں مذہب کے پردہ میں ہمیشہ سیاست کارفرما رہی ہے۔ خون ریزیوں کے ہزارہا واقعات جو سیاسی بنا پر ہوئے انھیں مذہب کی چادر سے ڈھانک کر چھپایا گیا ہے۔ اسلام کے تیرہ سو برس کے دور میں فقیہوں کا قلم ہمیشہ ننگی تلوار جیسا رہا ہے۔ ہزاروں حق پرستوں کا خون انہی کے فتووں کی بنا پر بہا ہے۔ اسلامی تاریخ کو کسی جگہ سے بھی پڑھئے۔ آپ کو ایسی صدہا مثالیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جب بھی کوئی حکمران خونریزی پر آمادہ ہوا ہے مفتی کے قلم اور سپہ سالار کی تلوار دونوں نے اس کا ساتھ دیا ہے۔ صرف صوفیائے کرام اور ملکی رہنماؤں ہی کو ان کا نشانہ نہیں بننا پڑا، علمار عظام میں سے بھی جو نکتہ بیں اور اسرار حقیقت سے واقف تھے انھیں بھی فقیہوں کے ہاتھوں مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں انھوں نے سر دے کر ہی نجات پائی۔"

آج کے دور کی بھی کچھ ایسی ہی حالت ہے، اسلام اور مسلم قوم کے نام پر جس طرح

لوگوں کو گمراہ کیا گیا ہے یا ستایا گیا ہے۔ اسکا حال اہل فہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے:-

"حقیقت هن حال جي، جي ظاهر ڪريان ذري،
لڳي ماٺ مرن کي، ڏونگر ڀون ڏري،
وڄن وڻ ٻري، اوڀڙ اپڙي ڪين ڪي!"

(اگر میں اس حال کی ادنیٰ ترین حقیقت کو بھی ظاہر کردوں تو انسان تو انسان جانور بھی سناٹے میں آجائیں۔ پہاڑ شق ہو جائیں۔ درخت جل اٹھیں اور زمین پر سبزہ اگنا بند ہو جائے)۔

بہر حال اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائیگا تو پتہ چلے گا کہ ساری خرابیوں کا سبب صرف اسلام کی غلط تعبیر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وقت آگیا ہے کہ اس حقیقت کو واضح ترین الفاظ میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

ہمارے یہاں عوام کو مذہب کے نام پر کھلم کھلا گمراہ کیا جاتا ہے اور موقع بموقع منافقت کی حد تک مذہبی طریقہ حکومت کا راگ الاپا جاتا ہے۔ ان بے بنیاد اور نمائشی ہتھکنڈوں نے ملکی مسائل کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ اس حد تک کہ حالات اب نازک دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور بہی خواہان ملک تردد میں مبتلا ہیں۔ اس صورت حال سے نجات صرف ایک ہی بات میں مضمر ہے وہ یہ کہ اسلام کی غلط تعبیر کو پوری طرح سمجھا اور سمجھایا جائے اسی طرح صحیح نتائج تک پہونچا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ ماضی میں نوع انسانی کی امن و سلامتی اور بہبود و ترقی کے لیے جو راہیں تجویز ہوئیں۔ ان میں مذہب کو اعلیٰ درجہ حاصل رہا ہے۔ عالمگیر مذاہب کی ایجاد کی تو غایت ہی یہی تھی لیکن تجربات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان مقاصد کو پس پشت ڈال کر بیشتر انھیں شخصی گروہی یا طبقاتی استحصال کے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان مذاہب کی ظاہری ترقی کے باوجود لوگوں میں اتفاق کی جگہ نفاق۔ محبت کے بجائے نفرت۔ عقل کی جگہ توہم پرستی۔ اور اصلاح کے بجائے بگاڑ پیدا ہوا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ مذاہب اپنے تئیں مقصودِ بالذّات نہ تھے بلکہ انسانی امن اتحاد اور ترقی کا ذریعہ تھے جن کی افادیت کا سارا دارومدار ان کے پیروؤں کی نیتوں اور اعمال پر رہا ہے۔

اسلام بھی عالمگیر مذاہب میں سے ایک ہے۔ عیسائیت۔ بدھ مت، ہندو دھرم اور کمیونزم کے پیروؤں کی طرح اہلِ اسلام بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کا مذہب مکمل اور سب سے برتر فلسفۂ حیات رکھتا ہے اور نوعِ انسانی کی نجات کا واحد راستہ ہے۔ اس دعوے کے مطابق دیگر مذاہب کی طرح اسلام کی بھی دو تعبیریں پیش کی جاتی رہی ہیں۔

ایک تعبیر اور تشریح وہ ہے جو خصوصی مفاد رکھنے والے حکمراں گروہوں اور ان کے جانبدار علما و فقہا کی جانب سے کی جاتی رہی ہے۔ اور دوسری تعبیر یا تشریح وہ ہے جو ان صوفیائے کرام اور اہلِ طریقت کی جانب سے پیش ہوتی رہی ہے جن کا تعلق اہلِ دل اور عوام سے رہا ہے۔

پہلی قسم کا گروہ متعدد مذاہب اور فرقوں کی تخلیق و تفریق کا سبب بنا ہے اور دوسرا گروہ عقاید کی کشمکش کی وجہ سے بکھر جانے والے لوگوں کو محبت کی لڑی میں منسلک کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے اور کثرتِ مذاہب کے پردے میں بنیادی وحدت کی نشاندہی کرتا رہا ہے۔

حکمراں گروہوں اور ان کے حواری مذہبی شارحین کی جانب سے اسلام کی جو تشریحیں کی گئیں ان کا لب لباب یہ ہے:

۱۔ انھوں نے اسلام کو دنیا کا آخری اور واحد دینِ حق قرار دیا اور اس کے علاوہ جملہ مذاہب کو منسوخ اور گمراہ ظاہر کرنے پر زور دیا۔

۲۔ دین کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسلام کو نوعِ انسانی کے جملہ مسائل کا حل ثابت کرتے ہوئے مکمل فلسفۂ حیات بھی قرار دیا۔

۳۔ انھوں نے دنیا و آخرت کے جملہ علوم و تعلیمات کا مخزن قرآن شریف کو سمجھنے پر زور دیا جسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والا خدا کا کلام مانا جاتا ہے۔ ان کی

جانب سے اس میں ہر زمانہ۔ ہر ماحول اور ہر مسئلہ کے لئے ایسے حل کے موجود ہونے پر اصرار کیا جاتا ہے جو اٹل اور ازلی و ابدی حیثیت رکھتے ہیں۔

۴۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو انھوں نے خدا کا آخری پیغمبر ہی نہیں دنیا کا آخری مصلح اور رہنما تسلیم کرنے پر زور دیا ہے۔ اور آپ کے بعض اقوال و اعمال کی نمائشی پیروی کو ہر حال میں لازم قرار دیا ہے۔

۵۔ اہلِ اسلام کو خدا کے نزدیک پسندیدہ ترین بندے قرار دینے کے ساتھ انھوں نے وحدتِ خیال و عمل کی بنا پر انھیں دنیا کی ایسی برگزیدہ اور مثالی قوم کہا جسے قیامت تک نوعِ انسانی کی رہبری اور رہ نمائی کے فرائض انجام دینے ہیں۔

۶۔ اسلام کو واحد دینِ حق سمجھنے کے ساتھ وہ اس کے دائرہ سے باہر کے جملہ افراد کو گمراہ اور کافر قرار دیتے ہیں۔ انھیں راہِ راست پر لانے اور ساری دنیا میں اسلام پھیلانے کو وہ مذہبی فرض کا درجہ دیتے ہیں۔ اور اس کے لئے تبلیغ اور جہاد کو ثواب گردانتے ہیں۔

۷۔ سیاست اور مذہب پر کس طرح کا تصرف رکھنے کے لئے انھوں نے دینی اور دنیوی اقتدار کو ایک ہی مرکز سے وابستہ رکھنے پر اصرار کیا ہے۔ خلیفۃ المسلمین کو نائب رسول اور اسلامی بادشاہ کو ظل اللہ (سایۂ خدا) قرار دے کر وہ ان کی بلا چون و چرا اطاعت کو دنیا اور عاقبت کا فریضہ گردانتے ہیں اور قرآن و سنت کی تشریح کا اہل صرف پسندیدہ علمائے دین کو تصور کرتے ہیں۔

اس گروہ کے مقابلہ میں صوفیائے کرام اور اہلِ طریقت کی جانب سے اسلام کی جو تعبیر کی جاتی رہی ہے اس کا ماحصل یہ ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر ملک۔ قوم اور زمانہ میں پیغمبر آتے رہے ہیں۔ جن کی تعلیمات کا بنیادی مقصد ہمیشہ انسان کی بھلائی امن اور ترقی رہا ہے۔ ان کی شریعتوں کے ظاہری اختلاف کے باوجود یہ حقیقت ہر ایک کے دین سے صاف جھلکتی ہے۔ اسلام نے اسی حقیقت کے اظہار کا پیغام دیا ہے۔

۲۔ ہر آدمی دنیا میں خدا کا نائب یا خلیفہ ہے جس میں نورِ الٰہی جلوہ گر ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی یا ہوا پر کسی خاص قبیلہ یا قوم کی اجارہ داری نہیں قائم ہو سکتی اسی طرح عالمگیر انسانی اخوت۔ امن اور بھلائی کے پیغام کو کسی ایک فرقہ، مذہب، گروہ یا قوم سے مخصوص کرنا قانونِ فطرت اور روحِ اسلام کے منافی ہے۔

۳۔ دین رضاکارانہ طور پر قبول کئے ہوئے عقیدوں کے مطابق زندگی گزارنے کا نام ہے۔ حکومت یا جماعتی نظام کے ذریعہ کسی دین کے عقاید کی تبلیغ کرنا یا طاقت اور قانون کے ذریعہ اسے لوگوں پر مسلط کرنا خدا کے بخشے ہوئے انفرادی آزادی کے حق کے خلاف ہے۔ پسندیدہ تبلیغ صرف وہی ہو سکتی ہے جس میں انفرادیت کا احترام قایم رکھتے ہوئے باہمی افہام و تفہیم، رواداری، محبت۔ خدمت اور اخلاق کے ذریعہ دلوں پر قبضہ جمایا جائے اور دلوں پر قبضہ جمانے کے لئے مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنا ضروری ہے۔ مذہب افراد کا ذاتی اور عاقبتی معاملہ ہے اجتماعی یا ملکی معاملہ نہیں۔

۴۔ دینِ فطرت کو ایک گروہ سے مخصوص کر کے اسے علیحدہ قوم شمار کرنا یا اسے بعض مخصوص رسوم و معاشرت سے موسوم کر دینا خود دینِ فطرت کی بنیادی غایتوں کے خلاف ہے۔ ہر راسخ العقیدہ اور صالح العمل شخص خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے چاہے اس کا ظاہری مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ہر وہ شخص خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے جو فاسق اور بدکردار ہو، چاہے وہ اسلام ہی کا پیرو کیوں نہ ہو۔ مذاہب کی تنگ نظرانہ گروہ بندیاں ان بزرگوں کی نظر میں غلط اور ناجائز نفاق کا سبب ہیں۔

۵۔ ہر وہ بات جو خودغرضی پر مبنی ہو۔ ہر وہ بات جس سے انسانوں میں نفرت اور نفاق پیدا ہوتا ہو۔ ہر وہ بات جو جبر و طاقت کے ذریعہ عمل میں لائی جاتی ہو اور ہر وہ بات جو اتحاد امن اور ترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہو ان کے تئیں صریح کفر ہے چاہے وہ اسلام کے مقدس نام پر ہی کیوں نہ کی جائے۔

دونوں گروہوں کی اسلامی تشریحات کے خاص خاص نکات پیش کرنے کے بعد اب میں پہلی تشریح کے غلط اور دوسری تعبیر کے صحیح ہونے کے بارے میں کچھ دلائل پیش کروں گا۔

اگر تعصب سے دامن چھڑا کر اس سارے مسئلہ پر انصاف کے ساتھ غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ پاکستان کی طرح دنیا کے بعض دیگر اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی پستی وزبوں حالی کا اصل سبب صرف مفاد پرستوں کی اسلامی تشریح اور اس پر سادہ لوح عامۃ المسلمین کا اعتقاد ہے۔ یہ بات آج کے دور کی پیداوار نہیں بلکہ پیغمبر اسلام کے وصال کے بعد سے چلتی آئی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبی اور غیر معمولی منتظم ہونے کی وجہ سے رسالت اور حکومت کا کاروبار ایک ساتھ خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ لیکن ان کی رحلت کے بعد جب دفتر رسالت ختم ہوا تو اشاعت مذہب اور کاروبار مملکت کو ایک ساتھ چلانے کے مسئلہ پر لوگ دو رایوں میں بٹ گئے۔ اسی وقت سے اسلام کی دو تشریحیں ہونے لگیں۔ ایک گروہ حکومت کے ذریعہ دین کو تنظیم و فروغ دینے کا حامی بن گیا اور دوسرا گروہ دین کو انفرادی معاملہ قرار دے کر اور اس کیلئے دلنشیں تعلیم اور پسندیدہ عمل کو واجب جان کر سیاست سے اس کی علیحدگی پر زور دینے لگا۔

پہلے گروہ نے مذہب و سیاست کو یکجا کر کے جہاد کو اپنی پالیسی کا مظہر بنایا۔ مسلمانوں کی توجہ فتوحات اور مالِ غنیمت کی طرف موڑ دی اور طاقت، دباؤ، رعایت اور لالچ وغیرہ کے ذریعہ غیر مسلموں کو دھڑا دھڑ دائرۂ اسلام میں شامل کرنے کو ترقی اسلام قرار دیا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ اس طرح محض تعداد بڑھانے کا قائل نہ تھا۔ رسمی عقاید اور روایتی ظاہر داریوں کو اہمیت دینے کے بجائے اس گروہ نے اسرارِ الٰہی اور رموزِ کائنات پر فکر کرنا اور خدمتِ خلق و اخلاقِ حمیدہ پر زور دینا ضروری سمجھا اور رضا کارانہ طور پر باصلاحیت اور صاحبِ قلب و شعور لوگوں کی تربیت میں مشغول ہو گیا۔ یہ گروہ شہرت و نمائش سے احتراز کرتا تھا۔ اور حرص و طمع

سے کنارہ کشی کرنے اور سادگی کے اپنانے کو مقدم جانتا تھا۔

چونکہ اکثریت جاہل، کوتاہ نظر، توہم پرست، طاقت پرست اور قدامت پسند رہی ہے۔ اس لیے حکمراں طبقہ کی اسلامی تشریح زیادہ عام رہی ہے۔ اسی طرح چونکہ باشعور، بے طمع، نڈر اور شہرت و اقتدار سے بے نیاز افراد کی تعداد ہمیشہ کم رہتی آئی ہے۔ اس لیے اسلام کی دوسری تعبیر بیشتر محدود رہی ہے۔

اس دوسرے گروہ میں جو لوگ اعتدال پسند رہے ہیں انھوں نے حکمراں طبقہ کی سختی اور عوامی جذبات کی ناپختگیؔ کے پیش نظر اپنی تعلیمات کو سینہ بہ سینہ اور اشاروں کنایوں کے ذریعہ اہلِ شعور تک پہونچانے پر قناعت کی اور وہ لوگ جو مصلحت وقت کے ایک حد سے زیادہ قائل نہ تھے۔ یا عوام الناس کے ضمیر دل کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کو بہتر خیال کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر اعلائے کلمۃ الحق کو اپنا شعار بنایا۔ ایسے ہی افراد کو حکمراں طبقہ اور اس کے حواری مذہبی شارحین نے خلیفۂ وقت کا باغی، رسمی عقاید و ضوابط کا منحرف اور اجماعِ امت کا منکر وغیرہ قرار دے کر گردن زنی ٹھہرایا اور انھیں طرح طرح کی اذیتیں پہونچانا ثواب جانا۔ حضرت امام حسینؑ منصور حلاج۔ شمس تبریز۔ سرمد شہید۔ شاہ عنایت صوفی اور مخدوم بلال وغیرہم کے اسمائے گرامی اس قسم کے بزرگوں کی طویل فہرست سے مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں کہ جنھیں محض اعلانِ حق کی وجہ سے اپنے وقت کے مفاد پرستوں کے مظالم کا نشانہ بننا پڑا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابنِ عباس سے روایت ہے کہ "مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں کہ اگر اس وقت انھیں ظاہر کردوں تو مارا جاؤں۔" اسی نوع کی صورت حال کے پیشِ نظر حافظ شیرازی کہتے ہیں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

عارفِ حقیقت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اسی کیفیت کے عالم میں رازدارانِ حال سے فرماتے ہیں:

ڪران وجهه ۾ وات، ڏول منهنجي ڪالهڙي،
مـچـڻ رَتيي رات، !ورڻ ۾ اونهي ٿئي

(اے عزیز! میرا راز زبان پر نہ آنے پائے۔ کم فہم لوگ اس کی گہرائیوں تک تو نہ پہونچ سکیں گے۔ البتہ مصیبت بن جائیں گے)۔

اس قسم کی فضا اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت پیش کرتی ہے کہ فتوحات، مراعات اور سختیوں کے سبب رسمی یا ظاہری قسم کے مسلمانوں کی تعداد میں بیشک دن دونا رات چوگنا اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن حقیقی اسلامی تعلیمات سے باخبر اور ان پر عامل افراد کی تعداد ہمیشہ ہی کم رہتی آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین کی رائے میں، اسلامی حکومت کہلانے والی مسلمانوں کی بیشتر حکومتوں کا اسلام اور اس کے حقیقی اصول و مقاصد سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ یہی صورتِ حال آج بھی ہے۔

مفاد پرستوں کی اسلامی تشریح کے نقائص

آیئے اب ذرا مفاد پرستوں کی اسلامی تشریحات کو علم و عقل کی حقیقت پسندانہ کسوٹی پر پرکھیں اور اس کا حسن و قبح معلوم کریں۔ جیسا کہ صفحاتِ گزشتہ میں عرض کیا جا چکا ہے اس گروہ کا پہلا خاص نعرہ اسلام کے آخری اور واحد دین ہونے کا ہے۔ میں اس مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے اسے دو حصوں میں تقسیم کروں گا۔ ایک یہ کہ مذہب کیا ہے دوسرے یہ کہ اس نعرہ کی حقیقت کیا ہے۔

مذہب کیا ہے؟ یہ موضوع نہایت ہی وسیع ہے۔ لاتعداد کتابیں اس پر لکھی جا چکی ہیں۔ اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ابتدائی ابواب میں اس موضوع پر میں بھی کچھ روشنی ڈال چکا ہوں۔ تاہم حافظہ کو تازہ کرنے کے لئے ان میں سے کچھ باتوں کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں۔

تاریخی اور سائنسی تحقیقات سے یہ حقیقت منظرِ عام پر آ چکی ہے کہ کرۂ ارض پر انسان لاکھوں برس سے رہتا آیا ہے۔ اس کے برعکس دنیا کے تین خاص مذاہب،

یہودیت، عیسائیت اور اسلام، بنی نوع انسان کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے شمار کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی سے حضرت آدم کا پتلا بنا کر اس میں روح پھونکی تھی۔ اس کے بعد ہی نسلِ انسانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ دنیا کے پہلے آدمی اور خدا کے پہلے پیغمبر تھے۔ اس عقیدہ کے مطابق اہلِ اسلام جو شجرہ پیش کرتے ہیں اس کے مطابق حضرت آدم کی تخلیق کو صرف ساڑھے سات ہزار برس گزرے ہیں۔ یہ بات سائنسی اور تاریخی تحقیقات کے یکسر خلاف ہے۔

وجودِ انسانی کے بارے میں ان دونوں میں سے کس بات پر اعتماد کیا جائے؟ وہ بات جو محض روایتی عقیدے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یا وہ بات جو علم و تحقیق پر انحصار رکھتی ہے؟۔ فی الواقع زمانہ اب اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ بے علموں یا ان لوگوں کے علاوہ جو کنویں کے مینڈک کی طرح اپنی محدود دنیا میں گم ہیں۔ کوئی بھی سائنسی حقیقتوں کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ یہ بات اتنی عام ہو چکی ہے کہ خود مذکورہ مذاہب کے بیشتر علماء بھی قدیم روایتی عقیدوں کو نئی تعبیروں کا جامہ پہنانے لگے ہیں ــــ بہرحال سائنسی تحقیقات کے ذریعہ تاحال دو لاکھ برس پہلے تک کی انسانی زندگی کے ثبوت مل چکے ہیں۔ مزید آگے چل کر اور کتنے قدیم دور کی نقاب کشائی ہوتی ہے فی الحال نہیں کیا جا سکتا۔

میں تاریخی اور سائنسی شواہد پر اعتماد کرتے ہوئے کرۂ ارض پر انسان کی لاکھوں برس کی قدیم زندگی کا قائل ہوں۔ اسی وجہ سے مذاہب کی پیدائش کو بھی اتنا ہی قدیم سمجھتا ہوں۔ سائنسی تفتیش سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان جانوروں کی شکل سے ترقی کر کے اپنی موجودہ جسمانی و ذہنی ترقی کے درجہ پر پہونچا ہے۔ بلاشبہ اس درجہ تک پہونچنے میں اسے کروڑوں برس لگے ہوں گے جس کے بعد ایک نامعلوم مدت دراز تک وہ جنگلوں، مرغزاروں اور پانی کے قریب والے خطوں میں وحشیانہ زندگی گزارتا رہا ہے۔ میں ماہرین علم الانسان کے اس خیال سے متفق ہوں کہ اسی دور میں اپنی بڑھتی ہوئی قوتِ گویائی اور ضروریات، نیز ترقی پذیر ذہنی لیاقت کی وجہ سے ان کے مختلف گروہوں نے اپنے

لیے تھا اپنے ماحول اور نفع و نقصان کے احتمالات کے پیشِ نظر خوف اور وہم کی بنیادوں پر بعض عقیدوں اور رسموں کو جنم دیا تھا۔ بجا طور پر انھیں مذہب کی ابتدائی شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ اس طرح وجود میں آنے والے عقاید و اصول ہر علاقہ اور قبیلہ میں مختلف تھے لیکن ان کے پیدا ہونے کے اسباب اور انھیں اختیار کرنے کی غایت بنیادی طور پر ایک ہی جیسی تھی۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، انسان وحشت کے دور سے گزر کر، بدّوی، زراعتی، تجارتی، ہنری اور سائنسی زمانہ میں داخل ہوتا گیا، اس کے اصل یا سابقہ عقیدوں اور رواجوں میں معاشرہ کی تبدیلی اور علم و تجربہ میں اضافہ کی وجہ سے تغیر و تبدل ہونے لگا۔

موجودہ دور کے جملہ بڑے مذاہب (ہندو دھرم۔ بدھمت۔ عیسائیت اور اسلام) گزشتہ پانچ ہزار برس کے اندر کی پیداوار ہیں۔ اس سے پیشتر بھی دنیا میں مختلف مذہبی عقاید و رسم رائج رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب چھان بین کی جاتی ہے تو جملہ موجودہ مذاہب عہدِ قدیم کے مذہبی عقیدوں عبادت کے طریقوں رسموں اور ضابطوں کی بنیاد پر تعمیر شدہ معلوم ہوتے ہیں۔ ذکر کردہ چار مذاہب کو بڑے مذاہب اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ان کے پیرو کار کروڑوں کی تعداد میں ہیں اور دنیا کے مختلف حصّوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان بڑے مذاہب نے اپنے پیشرو مذاہب کے اعتقادات اور رسم و رواج میں بہت کچھ ردّ و بدل اور اضافہ کیا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ "بہت کچھ" بھی چند خاص باتوں تک محدود ہے۔ یعنی خدا کے تصوّر اور حیات بعد الممات وغیرہم کے دائروں تک۔ اس کے علاوہ ماضی کے دیگر توہمات رسم و رواج اور سماجی و اخلاقی ضابطوں میں بنیادی تبدیلی لانے کے بجائے یا تو انھیں جوں کا توں رکھا گیا ہے یا ان میں محض سطحی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ اس صورتِ حال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے مذاہب کے بانیوں نے عام لوگوں کی روایت پرستی جہالت اور ذہنی پستی کے پیشِ نظر یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ زیادہ نئی باتوں کو قبول نہ کرسکیں گے چنانچہ انھوں نے رسومات و توہمات کی یکبارگی

کایا پلٹنے سے احتراز کیا۔
تقریباً سارے ہی بڑے مذاہب کی یہی حالت ہے۔ مذہبِ اسلام بھی اس کے کتنے ہی عقاید اور ضابطے قدیم مذاہب اور قبیلہ واری اعتقادات و ضوابط سے عبارت ہیں اور دیگر عالمی مذاہب سے مشابہت رکھتے ہیں اگر ان کی جڑیں تلاش کی جائیں تو معلوم ہو گا وہ نہ صرف عربوں کے ایامِ جاہلیت بلکہ انسان کے دورِ وحشت کی روایات پر استادہ ہیں۔ بیشتر رسومات و تصورات تو اتنے فرسودہ ہو چکے ہیں کہ نہ ان کی زمانۂ میں حال میں کوئی افادیت باقی رہی ہے اور نہ ہی وہ علم و عقل کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے جاری رکھنے کا کوئی مقصد ہی نہیں معلوم ہوتا اور دورِ حاضرہ میں مضحکہ خیز طفلانہ حرکتیں معلوم ہوتی ہیں۔
مثال کے طور پر معاد پرستوں کی اسلامی تشریح کے مطابق مندرجہ ذیل عقاید دارکان کو دینِ اسلام کی عمارت کا ستون قرار دیا جاتا ہے۔

۱۔ خدا کے شخصی تصوّر کا عقیدہ۔
۲۔ تخلیق انسانی، حیات بعد الممات، عالم برزخ، روزِ قیامت، پل صراط، میزان بہشت اور دوزخ کے عقیدے۔
۳۔ حج پر کعبہ کا طواف۔ منیٰ میں شیطانوں کو کنکریاں مارنا اور دوڑنا وغیرہ۔
۴۔ قربانی کرنا۔
۵۔ ختنہ کرنا
۶۔ بعض جانوروں کو نحس و سعد یا حلال و حرام جاننا۔
۷۔ فوت شدہ لوگوں کی روحوں کو نذریں دینا اور ثواب پہنچانے کے لئے فاتحہ وغیرہ دلوانا۔
۸۔ مختلف مادی مشکلات کے حل کے لیے ورد و وظائف۔ تعویز گنڈے اور جھاڑ پھونک وغیرہ کرنا۔
۹۔ مزارات پر فاتحہ پڑھنا۔ اور دعائیں مانگنا۔

۱۰۔ عبادتیں و ریاضتیں کرنا۔

چونکہ سطور بالا میں اس قسم کے عقاید و روایات کو میں نے عربوں کے ایام جہالت اور دور وحشت کے اوہام و رسوم سے تعبیر کیا ہے اس لئے اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ اپنے اس خیال کے حق میں مختصراً کچھ دلائل اور ثبوت بھی پیش کروں۔

۱۔ خدا کے شخصی تصوّر کا عقیدہ

اپنی بے بسی۔ اذیت۔ خوف اور بیماری وغیرہ کی حالتوں میں انسان کسی برتر مددگار یا مشکل کشا کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر ابتداء سے اس نے چند ایسی قوتوں پر اعتقاد قائم کیا جن سے اپنی نفسیاتی تسکین کی خاطر وقتاً فوقتاً رجوع کرتا رہا ہے۔ تحقیقات یہ بات ثابت کرتی ہے کہ نفسیاتی تسکین کی خاطر کسی وقت اس نے جانوروں جیسے کہ شیر۔ ہاتھی۔ بیل۔ گھڑیال۔ سانپ اور عقاب وغیرہ کی پرستش کی ہے اور کسی زمانہ میں پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں، درختوں، آگ، زمین، جن، بھوت، سورج، چاند اور ستاروں کو اپنا معبود بنایا ہے۔ اس ڈگر پر چلتے چلتے عہد قدیم کے انسانوں کا ذہن انسان پرستی کی طرف مائل ہو گیا۔ لاتعداد تاریخی شہادتیں اس بات کا واضح ثبوت پیش کرتی ہیں کہ ایک دور میں جادوگروں، مصلحوں اور بادشاہوں کو معبود سمجھا جاتا تھا۔ اسی دور کے بعد سے بت پرستی کا آغاز ہوا۔

بت پرستی کو رد کرنے والے بعد کے مذاہب نے خدا کے لکڑی یا پتھر کے مجسمہ کو تو داہیات قرار دیا۔ لیکن اس کے شخصی یا جسمانی تصور سے دامن نہ چھڑا سکے۔ کسی نہ کسی ہیئت میں انھوں نے خدا کو آسمانوں پر بیٹھا ہوا قرار دیا اور اسے کائنات کو پیدا کرنے و فنا کرنے، لوگوں کو رزق دینے اور چھیننے اور ان کے اعمال پر گرفت رکھنے اور جزا و سزا دینے وغیرہ کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کی عبادت اور پرستش کا سلسلہ شروع کر دیا۔

بائبل کی کتاب پیدائش کے باب اوّل کی آیت ۲۶ میں بیان کیا گیا ہے۔ "خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا"۔ عربی کا بھی ایک مشہور مقولہ "خلق اللہ آدم علی صورتہ" لفظ بہ لفظ یہی معنی دہراتا ہے۔ شخصی خدا کا یہی تصوّر مفاد پرستوں کے ان "اسلامی عقاید" سے جھلکتا ہے، جن کے مطابق خدا ساتویں آسمان پر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ہاتھ۔ پاؤں، آنکھیں، کان چہرہ اور جسم رکھتا ہے۔ وہ ساری کائنات کو پیدا کرنے والا، خلقت کو رزق پہنچانے والا۔ جزا و سزا کا مالک اور مارنے و جلانے والا ہے۔ پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب اس سے ساتویں آسمان پر جا کر ملاقات کی تھی۔ قیامت کے دن وہ نیچے آ کر زمین پر بیٹھے گا۔ جملہ انسانوں کے اعمال کا حساب کتاب میزان پر تولا جائے گا، جس کے مطابق انہیں دوزخ یا بہشت میں بھیجا جائیگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مقتدر شارحین اسلام جیسے کہ امام مالک بن انس، امام احمد بن حنبل، امام داؤد بن علی، امام ابو تیمیہ، امام ابو قیوم ابن ہیثم اور علامہ شوکانی وغیرہم انہی خیالات پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو "مذاہب اسلام" از محمد عبد الغنی)

قرآن پاک اور احادیث میں سے بھی ان عقاید کی حمایت میں حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ چند آیات و احادیث یہاں میں مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

۱۔ الرحمٰن علی العرش استویٰ (اللہ تعالیٰ آسمانوں کے عرش پر بیٹھا ہے)

۲۔ وجاء ربک والملک صفاً صفاً (جب تمہارا رب آیا تو ملائک صف در صف اس کے ساتھ آئے)

۳۔ ثم دنیٰ فکان قاب قوسین او ادنیٰ (آیت۔ جب معراج کی شب محمد صلعم خدا کے نزدیک ہوئے تو وہ نیچے آ گیا۔ پھر پیغمبر اور خدا کے درمیان کمان کے دو گوشوں جتنا یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔)

۴۔ ید اللہ فوق ایدیھم (آیت۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے)

۵۔ ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام (آیت۔ خدائے ذوالجلال والاکرام ہی کا چہرہ باقی رہے گا)

۶۔ ویوم یکشف عن ساق (آیت۔ جس دن تمہارے رب کی پنڈلی کھلے گی)۔

بعض ممتاز احادیث سے بھی خدا کے شخصی یا جسمانی تصوّر کے عقیدہ کی تائید ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر:

۱۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے "واما النار فلا تمتلی حتی یضع اللہ رجلہ" یعنی قیامت کے دن اس وقت تک دوزخ کی آگ کا جوش قرار نہ پائے گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا پاؤں ڈال کر اسے ٹھنڈا نہ کرے گا۔

۲۔ "ینزل ربنا تبارک و تعالیٰ کل لیلۃ الی السماء الدنیا" یعنی ہمارا رب ہر رات کو آسمان سے زمین پر آجاتا ہے۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے "ان اللہ یمسک السموات یوم القیامت علیٰ اصبع والارض علیٰ اصبع الخ"۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آسمانوں کو ایک انگلی پر رکھے گا اور زمین کو دوسری انگلی پر۔

غرض ان چند حوالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد خدا کے جسمانی یا شخصی تصوّر پر عقیدہ رکھتی آئی ہے بیشک جب سے مسلم فلسفیوں اور صوفیا کرام نے اس تصوّر کے خلاف دلائل پیش کیے ہیں۔ تب سے بعض علمائے ظاہر نے بھی اس تصوّر کو اپنایا ہے تاہم اب بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو خدا کو انسانی صفات سے موصوف کرتے ہیں۔ جیسے کہ دیکھنا یا سننا، ناراض یا خوش ہونا، وغیرہ۔ بعض علمائے ظاہر تو اب تک خدا کے شخصی یا جسمانی تصوّر کے مخالفین کو منکر و مرتد قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان باتوں سے اسلام کی برتری یا عظمت اور مقبولیت کے دعووں کو کوئی تقویت نہیں پہنچتی۔

۲۔ تخلیق انسان ۔ حیات بعد الممات ۔ عالمِ برزخ ۔ روزِ قیامت پل صراط ۔ میزان اور بہشت و دوزخ کے عقیدے

ان باتوں کے بارے میں بھی مفاد پرست جن عقاید پر اصرار کرتے ہیں وہ قدیم ادیان

پر مدار رکھتے ہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ روزِ میثاق جب اللہ تعالیٰ نے لفظ "کُن" ادا کیا تو ساری کائنات ایکبارگی پیدا ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی روحیں بھی وجود میں آ گئیں۔ روحوں نے خدا سے دریافت کیا کہ وہ اسے پہچانتی ہیں کہ نہیں۔ روحوں نے ہاں میں جواب دیا۔ بس اس وقت سے روحیں عالمِ ارواح میں رہتی ہیں۔ مقدر میں لکھے ہوئے وقت کے مطابق ان میں سے کچھ دنیا میں آ کر انسانی جسموں میں بسیرا کرتی ہیں اور اس کے بعد عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہیں۔ جہاں وہ قیامت کے دن تک رہیں گی۔ عالمِ برزخ میں پہنچنے والی روحیں دنیا کی طرح ادھر اُدھر گھومتی پھرتی ہیں کبھی زمین پر بھی اپنے متعلقین کو دیکھنے آ جاتی ہیں۔ نذرو نیاز کا کھانا کپڑا وغیرہ ان تک پہنچتا رہتا ہے۔

قیامت کس دن آئے گی؟ اس کے بارے میں کوئی بھی واضح تاریخ نہیں بتائی۔ البتہ قربِ قیامت کے جو آثار بتائے گئے ہیں ان میں سے خاص یہ ہیں کہ لوگ دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں کی زندگی اختیار کرنے لگیں گے۔ قیامت سے پہلے حضرت اسرافیل صور پھونکیں گے جس کی آواز سے زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے۔ پھر زمین ہموار ہو جائے گی بارشوں اور سمندروں اور دریاؤں کا سیلاب زمین کو جل تھل کر دے گا۔ روحیں اپنے پرانے جسموں میں لوٹ آئیں گی۔ سارے مرد انسان حشرات الارض کی طرح سطحِ زمین پر چھا جائیں گے۔ سورج سوا نیزے کی بلندی پر آ جائے گا۔ بنی آدم اپنے پیغمبروں سمیت نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے۔ سب کو پلِ صراط سے گزرنا پڑے گا۔ جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہو گا۔ جن لوگوں نے جانوروں کی قربانیاں دی ہوں گی یا مسجدیں بنوائی ہوں گی وہ ان پر بیٹھ کر آرام سے گزر جائیں گے۔ گنہگار اس پل سے نہ گزر سکیں گے اور کٹ کٹ کر نیچے گر جائیں گے۔ اس پل کے دوسری جانب ایک وسیع میدان میں اللہ تعالیٰ کرسی پر بیٹھا ہو گا۔ اس کے سامنے میزان لگی ہو گی جس میں ہر آدمی کے گناہ اور ثواب تولے جائیں گے۔ جس کے گناہ زیادہ ہوئے اسے دوزخ میں اور جس کے ثواب زیادہ ہوئے اسے جنت میں بھیجا جائے گا۔

بہشت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں سونے چاندی اور جواہرات کے محل اور

خوشنما باغات ہوں گے جن میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہوں گی۔ جنت میں داخل ہونے والوں کی خدمت کے لئے حوریں اور غلمان دستیاب ہوں گے۔ جنت کی دلکشی کے مقابلے میں دوزخ کو بید مہیب بیان کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے وہاں آگ ہی آگ ہے دوزخ میں جانے والوں کو وہاں طرح طرح کی اذیتیں دے کر آگ میں جلایا جائیگا۔ مسلمانوں کے سوا دنیا کے سارے مذہب کے لوگوں کو جہنم میں ڈالا جائیگا اور خود مسلمانوں کے بھی تہتر فرقوں میں سے بہتر کو دوزخ میں جھونک کر صرف ایک فرقہ کے لوگوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ گویا جس طرح دنیا کی آبادی کی بہت بڑی اکثریت دنیا میں طرح طرح کے عذاب ومصائب برداشت کرتی ہے اور چند سرمایہ دار اور زمیندار عیش کرتے ہیں۔ اسی طرح دوزخ میں جانے والوں کی تعداد بھی زیادہ اور جنت میں جانے والوں کی تعداد بہت کم ہوگی۔

یہ اعتقادات مفاد پرستوں کی اسلامی تعبیر کے بنیادی ستون ہیں۔ جس کے ذریعہ خداوند تعالیٰ کو ایسا جابر اور قہار بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کو صرف اس لئے عذاب دے گا کہ وہ مفاد پرستوں کی مضحکہ خیز اسلامی تعبیر کے پیروکار نہ ہوں گے۔ اس تعبیر کے مطابق رب العالمین جو دنیا میں ہر ایک کا پالنہار ہوتا ہے۔ عاقبت میں مسلمانوں کے صرف ایک فرقہ کا سرپرست یا لیڈر بن کر رہ جاتا ہے۔

اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا باتوں میں سے کتنے ہی عقیدے قدیم مذاہب و اوہام سے اخذ کئے گئے ہیں، مصر کے اہراموں کے اندر جو کہ یہودی اور عیسائی مذہب کی ایجاد سے پہلے کے بنے ہوئے ہیں، اس قسم کی تصویریں اور مجسمے ملتے ہیں جن سے اس قسم کے عقیدوں کی قدامت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ قدیم دیومالائی داستانوں سے بھی اس نوع کے تصورات کا پتہ چلتا ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر میں نہیں سمجھتا کہ اس قسم کے فرسودہ عقاید کی بنیاد پر اسلام کو دین فطرت یا دنیا کا واحد اور آخری نجات دہندہ دین ثابت کرنے میں مدد مل سکتی۔

۴۔ حج پر کعبہ کا طواف کرنا، منیٰ میں شیاطین کو کنکریاں مارنا، دوڑنا اور حجرِ اسود کو بوسہ دینا

ان میں سے بیشتر رسمیں ایامِ جہالت سے عربوں میں رائج تھیں اور بعض تو حضرت ابراہیم سے بھی قبل کی ہیں۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم سے کعبہ کی عمارت جو کہ مربع شکل کی ہے، عربوں کی عبادت گاہ رہی ہے۔ جسے بعد میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے درست اور پاک کر کے اپنے معبود کی عبادت گاہ میں تبدیل کیا۔ حجرِ اسود کے بارے میں بعض محققین کا خیال ہے کہ قدیم عبادت گاہ میں اس کی حیثیت سیرت کے پتھر کی تھی اور بعضوں کے خیال میں وہ قدیم دیوتاؤں میں سے ایک یعنی "زہرہ" کا نشان تھا۔ جسے قدیم عبادت گاہ کی تطہیر کے باوجود ایک گوشے میں رکھ دیا گیا تھا۔ ایک معینہ وقت پر پہلے بھی وہاں لوگ ہر سال تیرتھ کرنے آیا کرتے تھے۔ اور وہ ایک معروف مندر یا بتکدہ تھا۔ عہدِ قدیم کے سورج دیوتا کے مندروں کے طریقہ عبادت کی طرح اُس وقت بھی اس کا طواف کیا جاتا تھا۔ شیطانوں کو کنکریاں مارنے کی رسم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قدیم عرب کے مخالف اور ناپسندیدہ دیوتاؤں کے خلاف نفرت و احتجاج کے مظاہرہ کی علامت ہے اور ایامِ جاہلیت سے چلی آتی ہے۔ منیٰ میں دوڑنے کی رسم کے بیان میں کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی مصری بی بی حاجرہ کو وہاں تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہیں ان کے بطن سے حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ اس مقام پر پانی کی تلاش میں وہ مضطرب ہو کر اِدھر اُدھر دوڑیں چنانچہ قدرتِ الٰہی سے اسی جگہ پانی کا ایک چشمہ پیدا ہو گیا۔ دوڑنے کی رسم بی بی حاجرہ کی بے چینی کی تقلید میں ادا کی جاتی ہے۔

ان رسومات کی ادائیگی میں سوائے اس کے کہ پرانی روایات کی تکریم ہو کوئی ایسی افادیت یا دینی اہمیت اور رہبری نظر نہیں آتی کہ انھیں فرض تصور کیا جائے اور اسلام کو دینِ فطرت

اور دنیا کا آخری اور واحد نجات دہندہ مذہب ثابت کرنے کے لیے ان پر زور دینا لازمی سمجھا جائے۔

۴۔ جانوروں کی قربانی

قرآنِ پاک میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے خواب دیکھا۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کے بیٹے حضرت اسماعیل کی قربانی طلب کی جاگنے پر اس حکم کی تعمیل میں جب انھوں نے حضرت اسمٰعیل کو ذبح کرنے کی کوشش کی تو فرشتوں نے حضرت اسماعیل کی جگہ ایک دنبہ کو حضرت ابراہیم کی چھری کے نیچے کر دیا۔ قربانی کی رسم اسی واقعہ کی سنت کے طور پر اختیار کی گئی۔ بائبل میں حضرت اسماعیل کی جگہ حضرت اسحٰق کا نام دیا گیا ہے۔ بہرحال دونوں مقدس کتابوں میں اس قربانی کی وجہ حکم خداوندی بیان کی گئی ہے۔

قدیم مذاہب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قربانی کا رواج حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی ہزارہا برس پرانا ہے۔ تقریباً سارے ہی قدیم مذاہب میں یہ دستور رائج تھا۔ تاریخی تفتیش بتاتی ہے کہ یہ رسم انسانوں کے دورِ وحشت کے رسمات میں سے ایک ہے جس کے مطابق معبودوں کی ناراضگی دفع کرنے یا ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر قبیلہ کے کسی ایک آدمی کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا۔ اس دور میں خدا کو ایک ایسا خونخوار جاندار یا دیوتا سمجھا جاتا تھا جو انسانی خون سے کم پر راضی نہ ہوتا تھا۔

خدا کے بارے میں حضرت ابراہیم کا تصور بھی اسی پرانے عقیدہ سے ملتا جلتا تھا۔ چنانچہ اس کی رضا جوئی حاصل کرنے کی خاطر وہ اپنے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بائبل (توریت) کی کتاب پیدائش باب ۱۸ میں مرقوم ہے کہ اللہ تعالیٰ دو فرشتوں کے ساتھ مرے میں دوپہر کے وقت حضرت ابراہیم کو نظر آیا۔ انھوں نے بڑھ کر تینوں کا استقبال کیا۔ منت سماجت کر کے انھیں روکا۔ ان کے پیر دھلائے اور ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کر کے ان کی ضیافت کی۔ کھانے سے فارغ ہو کر خداوند خدا نے انھیں بشارت دی کہ بی بی سارہ کے بطن سے ان کے بیٹا پیدا ہوگا۔ وہ دونوں کافی عمر رسیدہ ہو چکے تھے

اس حد تک کہ بی بی سارہ کا حیض بند ہو چکا تھا۔ لیکن اس دعا کی وجہ سے اللہ کے فرزند پیدا ہوا جس کا نام اسحاق رکھا گیا۔ اس وقت حضرت ابراہیم کی عمر ایک سو برس تھی۔ اور بی بی سارہ کی عمر نوے سال تھی۔ اس مثال اور سطور بالا میں دیئے ہوئے قرآن وا حادیث کے حوالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم کا اپنے دور کے مطابق خدا کے بارے میں کس نوعیت کا تصور تھا۔

اس دور میں خدا کو صرف ایک ایسی جبار و قہار قوت مانا جاتا تھا جسے قربانی کا گوشت و خون بے حد مرغوب تھا۔ رحمان و رحیم خدا کا تصور اس کے بہت بعد کا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نا پختہ تصورات کے دور کے عقیدۂ قربانی کو آج بھی اسلام کا رکن خاص قرار دینا دین فطرت کی عظمت و برتری کے دعوے کو کس حد تک تقویت پہونچاتا ہے؟

۵۔ ختنہ

بعض لوگ اس رسم کو "مسلمانی" بھی کہتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ رسم اسلام سے بہت پہلے کی ہے اور یہودیوں میں بھی رائج ہے۔ اس کا آغاز حضرت ابراہیمؑ سے ہوا۔ بائبل کی کتاب پیدائش کے باب ۱۷ میں بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم ننانوے برس کے ہوئے تو خداوند خدا ان کے پاس آیا اور ان سے گویا ہوا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں بیٹا دوں گا۔ جس سے بادشاہ پیدا ہوں گے۔ وہ مجھے خدا مانیں گے۔ اس کے عوض میں چاہتا ہوں کہ تو اپنا ختنہ کرا اور اپنی اولاد کو بھی ختنہ کرانے کی تاکید کر۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ختنہ کرایا اور اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کا بھی ختنہ کرایا۔ جن کی عمر تیرہ برس تھی۔ مسلمانوں اور یہودیوں نے یہ رسم حضرت ابراہیمؑ کی سنت کے طور پر اپنے اپنے دین میں داخل کی۔

تازہ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ ختنہ کی رسم عہد قدیم کی وحشی اقوام میں بھی رائج تھی۔ آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ۔ قدیم افریقہ اور امریکہ کے وحشی قبائل بھی اس رسم کو اپناتے تھے۔ جبکہ ان کا حضرت ابراہیمؑ یا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

اہلِ ہند میں "شیو لنگ" اور یونانیوں اور دیگر اقوام میں "فلیس" کی پوجا سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس رسم کا ان تصوّرات سے کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔ جو حضرت ابراہیمؑ کے دور سے پیشتر کا ہے۔ بہر حال دو رِ وحشت کی اس قدیم رسم کو آج کے اسلام کا دینی فریضہ قرار دینا اور دنیا و عاقبت میں برکت و نجات کی لازمی شرط ٹھہرانا عجیب سی بات ہے۔

جو حضرات اس مسئلہ پر تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہیں وہ سر جان فریزر کی تحقیقاتی کتاب "گولڈن بو"، یا "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" کے لفظ "فلزم" کی تشریح کا مطالعہ فرمائیں۔

۶۔ جانوروں کو پاک یا نجس جاننا

بعض جانوروں کو پاک اور بعض جانوروں کو نجس تصوّر کرنا اہلِ اسلام کے لیے لازمی دینی شرط قرار دی جاتی ہے۔ کتےّ اور سُوّر کو خاص طور پر بیحد نجس سمجھا جاتا ہے۔ یہودی بھی ان دونوں جانوروں کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن سعد و نجس کا یہ تصوّر نہ یہودیوں کی ایجاد ہے نہ اسلام کی؛ بلکہ سامی النسل عربوں میں اس کا رواج ان دونوں مذاہب کے وجود سے پیشتر بھی رہا ہے۔

اس تصوّر کی جڑیں انسان کے اس دورِ وحشت اور توہم سے جا ملتی ہیں۔ جب وہ جنگلوں میں رہا کرتا تھا۔ اور انتہائی ضعیف الاعتقاد ہونے کے سبب بات بات سے شگون لیا کرتا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب وہ اپنی غذا کی تلاش کے لیے نکلتا تو درندوں اور جنگلی بلاؤں سے محفوظ رہتے ہوئے اپنی خوراک پا لینے کی خواہش کے تحت وہ مختلف چیزوں کو اپنی کامیابی یا ناکامیابی کی علامت قرار دیتا۔ اس ضمن میں جانے پہچانے جانور اور پرندے اور ان کی آوازیں یا حرکتیں ان کے تئیں نیک یا بد شگون کی مظہر ہوتیں۔ اگر اپنی مہم پر روانگی کے وقت کوئی ایسا جانور انھیں دکھائی دیتا جو ان کے یا ان کے بزرگوں اور ساتھیوں کے تجربات کے مطابق ان کی کامیابی کی بشارت سمجھا جاتا تو وہ اسے نیک فال یا سعد قرار دیتے اور

اگر وہ جانور اس کے برعکس ہوتا تو اسے بدفال یا نحس قرار دیتے ۔ عہدِ قدیم کے انسان کے اس طرح نحس و سعد قرار دیتے ہوئے جانوروں کو ماہرینِ علم الانسان نے Totem اور ٹابو Taboo کے نام دیئے ہیں ۔ اس توہم کی بنا پر بعد میں کتنے ہی قبائل نے سعد جانوروں کی شبیہیں یا بت بنا کر اپنے پاس رکھ لیے تاکہ صبح اُٹھتے ہی اور مہم پر جانے سے پہلے نیک شگون کے طور پر وہ انھیں دیکھ لیا کریں ۔ آگے چل کر انھیں پسندیدہ اور سعد جانوروں کی پرستش شروع ہو گئی ۔ اسی طرح نحس جانوروں کو ہلاک کرنے یا ان کی نحوست سے بچنے کے لیے مختلف جتن اختیار کیے گئے ۔ شیر، ہاتھی، گائے، سانپ گھڑیال، عقاب وغیرہ کی پرستش کا رواج آج بھی بعض انسانی گروہوں اور مذاہب میں اسی وجہ سے رائج ہے ۔ بعض قبائل اور ان کے افراد کے نام بھی آج تک اپنے پسندیدہ اور سعد جانوروں کے نام پر رکھے جاتے ہیں ۔ اور دنیا کے کتنے ہی لوگ آج بھی بلی، تیتر لومڑی اور دیگر جانوروں اور پرندوں سے مختلف قسم کے شگون لیتے ہیں ۔

سور سے نفرت کے بارے میں تحقیق و تفتیش سے پتہ چلتا ہے کہ ہزاروں برس پیشتر ایشیائے کوچک (ترکی) میں فرِگیا اور لڈیا کے علاقوں کے قدیم باشندے دیوتا آٹیس اور اس کی بیوی کی پرستش کرتے تھے ۔ اپنی دیومالائی داستانوں سے انھیں یہ معلوم ہوا تھا کہ آٹیس دیوتا جب سور کا سکار کرنے گیا تھا تو سور نے اسے ہلاک کر دیا تھا ۔ چنانچہ اس وجہ سے یہ جانور اس دیوتا کے پیروؤں کے تئیں نحس Taboo ٹھہرا تھا ۔ وہاں کے باشندے قدیم سامی النسل تھے ۔ اس نسل کے بعد کے لوگوں نے بھی اپنے بزرگوں کی تقلید میں سور کو قابلِ نفرت سمجھا ۔ چونکہ یہودی اور مسلمان عرب سبھی سامی النسل ہیں اس لیے بعد میں انھوں نے بھی اس تصوّر کو اپنا لیا ۔ (ملاحظہ ہو سر جان فریزر کی کتاب "گولڈن بو")

دراصل عربوں میں سور کو قابلِ نفرت سمجھنے کا تصوّر اتنی شدید نسلی روایت بن چکا تھا کہ ان میں اسلام کو مقبول بنانے کے لیے اس کی نفرت کے تصوّر کو بحال رکھنا ضروری بن گیا تھا ۔ لیکن یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ تصوّر نہ تو اسلام کا ایجاد کردہ ہے اور نہ ہی ایسی دینی اہمیت رکھتا ہے کہ اسے آج بھی بنیادی رکن یا شرطِ اسلام قرار دینے پر

اصرار کیا جائے۔

۷۔ فوت شدہ لوگوں کی نذر اور فاتحہ وغیرہ

میں پہلے ذکر کر آیا ہوں کہ اسلام میں قدیم مذاہب کے جو عقاید اختیار کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مرنے کے بعد آدمی کی روح قیامت تک عالم برزخ میں رہتی ہے۔ جہاں وہ اس دنیا کی طرح چلتی پھرتی اور کھاتی پیتی ہے۔ اور دنیا ہی جیسی ضرورت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس عقیدے کے مطابق فوتی کے وارثین کے لئے اس کے کھانے پہننے وغیرہ کا انتظام کرنا ضروری قرار پاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں وہ جو بھی کھانا کپڑا فوتی کے نام پر کسی مستحق کو دے گا اس کا فائدہ عالم برزخ میں فوتی کی روح کو پہنچے گا۔ اسی خیال کے مطابق کسی کے مرنے کے بعد معینہ اوقات پر کچھ رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ جیسے کہ سوئم۔ دسواں۔ بیسواں۔ چہلم اور برسی وغیرہ۔ ان ایام میں قرآن اور سیپارے پڑھوا کر فوتی کی روح کو بخشے جاتے ہیں۔ فاتحہ خوانی کی جاتی ہے۔ ملاؤں۔ غریبوں اور فقیروں کو کھانا کپڑا دیا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس بارے میں بھی یہ عقیدہ عام ہے کہ فوتی کی روح اپنے گھر واپس آتی ہے اور جب دیکھتی ہے کہ اسے ثواب پہنچانے کے لئے یہ رسمیں ادا کی جا رہی ہیں تو خوش ہو کر واپس چلی جاتی ہے بصورتِ دیگر رنجیدہ ہو کر بد دعا دیتی ہے۔

اگر ان رسوم و عقاید کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ باتیں نئی یا اسلام کی ایجاد کردہ نہیں بلکہ انسان کے دورِ وحشت سے چلی آ رہی ہیں۔ قدیم مقابر کی کھدائی سے پتہ چلا ہے کہ دورِ جہالت میں بھی یہ عقیدہ عام تھا کہ مرنے کے بعد بھی فوتی کی ضروریات دنیا کی طرح ہوتی ہیں۔ مصر کے اہراموں میں سے برآمد ہونے والی اشیاء سے ثابت ہوتا ہے کہ اسی خیال کے پیشِ نظر عہدِ قدیم میں فوتی کے ساتھ اس کے کھانے پینے اور آرائش و زیبائش کے سامان اور اسلحہ و سواری وغیرہ سب ہی کو دفنایا جاتا تھا۔ کہیں کہیں تو فوتی کے خدمت گاروں اور اس کی عورتوں کو بھی جیتے جی ان کے ساتھ دفن کر دیا جاتا

تھا۔ تاکہ وہ حسب دستور فوتی کی خدمت انجام دیا کریں۔ چین میں کسی زمانے میں یہ عام رواج تھا۔ مغلوں کے خانِ اعظم چنگیز خان نے جب وفات پائی تو دیگر ساز و سامان کے ساتھ اس کی بیویاں بھی اس کے ساتھ دفنا دی گئی تھیں۔ ہندوؤں کی ستی کی رسم بھی یہی نوعیت رکھتی ہے۔ غرض مختلف مذاہب و علاقہ کے لوگوں کا تصوّر اس سلسلہ میں ایک دوسرے سے ملتا جلتا رہا ہے۔ مسلمانوں نے بھی قدیم عقاید کی پیروی کچھ مختلف شکل میں جاری رکھی اور فوتی کی خاطر کھانا کپڑا تقسیم کرنے اور تلاوت و فاتحہ وغیرہ کی رسمیں اختیار کیں۔ ہندوؤں کی رسوم "چاننھا" اور "پاٹ" اسی تصوّر کی مختلف شکلیں ہیں۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو اسلام میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہر آدمی کو اس کے اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔ اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ فوتی کے لئے کی جانے والی خیرات اور فاتحہ وغیرہ کا ثواب اس کے گناہوں کو زائل کر کے اس کی نجات کا سبب بن جاتے ہیں۔ اگر اس اعتقاد پر ایمان رکھا جائے تو پھر ذاتی عمل کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ اس سے دولت مندوں کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے کہ وہ چاہے کتنے ہی برے اعمال کیوں نہ کریں ان کی چھوڑی ہوئی دولت میں سے چند ملاؤں اور فقیروں کو کھانا وغیرہ دے کر ان کے وارثین انھیں عذابِ آخرت سے نجات دلا دیں گے۔ اس قسم کا عقیدہ کسی طرح بھی ایسے مذہب کی تصویر پیش نہیں کرتا جسے دنیا کا آخری اور واحد دینِ حق کہا جائے۔ یا جس کے پیروؤں کو دنیا کی بہترین قوم قرار دیا جا سکے۔

۸۔ ورد و وظائف۔ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک وغیرہ

مختلف مادی مشکلات کے حل کے لئے بعض دعاؤں، وظیفوں، تعویذوں اور جھاڑ پھونک وغیرہ پر ایمان رکھنا اور ان کے ذریعہ غیبی امداد حاصل ہونے کی توقع رکھنا بھی "اسلامی عقاید" کہے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر کتنی ہی کتابیں لکھی گئی ہیں

اوران عقاید کی تائید میں قرآن و احادیث کے حوالے بھی دیئے جاتے ہیں ۔ بلا شبہ وہابی تعلیمات اور دورِ حاضرہ کی فضا کی وجہ سے بہت سے لوگ ان باتوں کو ترک کر چکے ہیں لیکن مفاد پرستوں کی تعبیر والے اسلام میں اب بھی ان اعتقادات کو اسقدر اہمیت دی جاتی ہے کہ بعض دعاؤں اور آیات میں تاثیر نہ تسلیم کرنے والوں کو بے ایمان بلکہ مرتد اور کافر تک قرار دیا جاتا ہے ۔ بیشتر پیروں فقیروں اور ملاؤں کا تو ذریعہ معاش اور کاروبار ہی درود وظائف دعاؤں اور تعویذ گنڈے پر ہے ۔

فی الواقع یہ عقاید بھی اسلام سے بہت پہلے کے ہیں اور دورِ وحشت کی یادگار ہیں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے دورِ وحشت و جہالت میں جادو کے منتر یا اشلوک وغیرہ پڑھے جاتے تھے ۔ اور آج آیاتِ قرآنی یا اسمائے ربانی کا ورد کیا جاتا ہے ۔ تعویذوں پر پہلے دوسری طرح کے نشانات درج کئے جاتے تھے اب ابجد کے مطابق نقش بھرے جاتے ہیں یا آیات اور ملائکہ کے نام لکھے جاتے ہیں ۔ لوبان جلانا اور مریضوں پر سے اشیا یا جانوروں کو تصدق کرنے کا طریقہ تو کم و بیش عہد قدیم ہی کی طرح کا چلا آتا ہے ۔

ماضی میں اس قسم کے توہمات کو جو بھی وقعت حاصل رہی ہو لیکن دورِ حاضرہ میں اسے بے مقصد خود فریبی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ اور اگر دنیاوی مشکلات کے لیے بعض دعاؤں ۔ آیات اور اسمار کے ورد کی تاثیر پر ایمان رکھنا اسلام کا لازمی عقیدہ قرار دیا جاتا ہے تو اس دعوے کے باوجود کہ اسلام دنیا کا آخری اور اعلیٰ ترین دینِ فطرت ہے، مسلمان دنیاوی ضروریات اور رہنمائی کے لیے دوسروں کے محتاج تو ہمیشہ کے لیے رہ سکتے ہیں لیکن رفعت یا سرفرازی حاصل نہیں کر سکتے ۔ یہ عقیدہ جہدِ حیات میں بھرپور اور حقیقت پسندانہ حصہ لینے سے روکتا ہے اور فرار اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے ۔

۹۔ قبروں اور مزارات پر فاتحہ پڑھنا اور دُعائیں مانگنا

عزیز و اقارب کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھنا اور بزرگوں کے مزارات پر حاضر ہو کر دعائیں مانگنا اہلِ اسلام کا معروف دستور ہے۔ قبر کے اندر پیش آنے والے معاملات کے سلسلہ میں یہ عقیدہ عام ہے کہ مردہ کو دفن کرنے کے بعد وہاں منکر نکیر نام کے دو فرشتے آتے ہیں اور فوتی کو زندہ کر کے اس سے چند سوالات پوچھتے ہیں۔ تیرا خدا کون ہے؟ تیرے رسول کا کیا نام ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ مرتے وقت ہر مسلمان کو کلمہ پڑھایا جاتا ہے اور دفن کے بعد اس کی قبر پر "اللہ ربی"، "محمد رسولی و اسلام دینی" کے الفاظ ادا کیے جاتے ہیں۔ تاکہ مردہ انھیں سن کر منکر نکیر کو صحیح جوابات دینے کے قابل ہو جائے۔

فوت شدہ لوگوں کے بارے میں رائج اس قسم کے جملہ عقاید دراصل دورِ وحشت کے اُن عقاید کی شاخیں ہیں جس کے تحت مرے ہوئے لوگوں کو دنیا میں سرگرم عمل سمجھا جاتا تھا۔ ان کی پرستش کی جاتی تھی، اور انھیں اپنا محافظ و مددگار تصور کیا جاتا تھا۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، امریکا اور افریقہ کے قدیم وحشی اقوام کے تفصیلی مطالعے سے ان عقیدوں کا سارا حال معلوم ہوتا ہے۔ جاپان میں ابتک مرے ہوئے عزیزوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ مصر، چین اور مرکزی ایشیا میں مُردوں کو حنوط کر کے دفن کیا جاتا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ مرنے کے بعد بھی روح و جسم اکٹھے ہی رہتے ہیں۔ اور اگر جسم کو محفوظ کر دیا جائے تو قیامت کے دن مردوں کو اُٹھنے میں دقت نہ ہوگی۔ ان مردوں کے کفن کے ساتھ "پاپیروس" پر کچھ ہدایتیں بھی تحریر کی جایا کرتی تھیں۔ اسلام کے بعض فرقوں میں میت کے ساتھ عہد نامہ اور بعض آیات دفن کرنے کا طریقہ اسی رسم کی پیروی ہے۔ قبروں کے اوپر آیاتِ قرآنی کا لکھنا تو تقریباً سارے ہی فرقوں کے مسلمانوں میں بہتر سمجھا جاتا ہے۔ بزرگوں کے مزارات پر حاضری دینا۔ منت ماننا۔ غلاف و چادر چڑھانا

بال کٹوانا۔ مہندی لگانا۔ اور نفیری اور نقارے بجانا وغیرہ وغیرہ بھی سب عہد قدیم کی رسومات کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس قسم کی رسومات اور اعتقادات کو اسلام کا دینی جزقرار دینا اسلام کی عظمت کے دعوے کی نفی کرنے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

۱۰۔ عبادتیں و ریاضتیں

مفاد پرستوں کی اسلامی تعبیر کے مطابق نماز کو بنیادی عبادت اور روزہ کو لازمی ریاضت قرار دیا جاتا ہے۔ اور ان دونوں کا شمار اسلام کے ارکان خمسہ میں کیا جاتا ہے۔ ان ارکان کی ادائیگی پر اتنی شدت کے ساتھ زور دیا جاتا ہے اور انھیں کچھ اس طرح شرطِ اسلام قرار دیا جاتا رہا ہے کہ ان ارکان کی اہمیت صرف ظاہری اور رسمی بن کر رہ گئی ہے۔ بیشتر لوگ تو یہ عقیدہ رکھتے آئے ہیں کہ نماز روزہ خود ہی مقصود بالذات ہیں اور ان کے احکامات کی اس کے علاوہ کوئی غایت نہیں کہ مقررہ ضابطوں کے مطابق رکوع و سجود ادا کئے جائیں اور معینہ اوقات میں کھانے پینے سے احتراز کیا جائے۔ آج تک اسلام کے نام پر مسلمانوں نے جتنی بھی خلاف اسلام حرکتیں کی ہیں ان سب کو محض اسی عقیدہ کی بنا پر قلبی اطمینان حاصل رہا ہے۔ نماز روزہ کی ادائیگی کے بعد وہ اپنی غرض اور خواہش کے مطابق اپنے ہر فعل کو اسلام کی گرفت سے آزاد تصور کرتے آئے ہیں چاہے وہ کتنی ہی سنگین نوعیت کا انسانی اور سماجی جرم ہی کیوں نہ ہو۔ گویا ان ارکان پر زور دینے سے انفرادی اور اجتماعی کردار کی تو خاطر خواہ اصلاح نہ ہوئی البتہ ان کی ادائیگی سے پیدا ہونے والی خود اعتمادی اور اطمینانِ قلبی کی وجہ سے من مانیوں کو چھوٹ ضرور مل گئی۔

(ب) مفاد پرستوں کے نعرہ کی حقیقت:- پیش کردہ تجزیوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جن عقاید و رسوم کو مفاد پرست اسلام کی بنیادی شرط یا روح قرار دیتے ہیں وہ محض قدیم روایات کی ایسی نمائشی شکلیں ہیں جن سے دین یا دنیا کا کوئی ایسا

اعلیٰ وارفع مقصد پورا نہیں ہوتا کہ جس کی بنیاد پر اسلام کو دوسرے مذاہب پر برتری حاصل ہوتی ہو یا اس کے آخری اور واحد دینِ حق کے دعوے کو تقویت ملتی ہو۔

فی الواقع اس قسم کے عقائد و رسوم صرف روایتی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جس قانونِ ارتقاء کے مطابق جمادات سے نباتات. نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے انسان وجود میں آئے ہیں اسی قانون کا اطلاق ان پر بھی ہوتا ہے۔ انسانی عقل، علم، رسم و رواج، عقیدے و دستور۔ تجربوں اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اخلاقی و معاشرتی ضابطوں اور مذہبی عقاید و رسوم میں ہر دور کے حالات اور تقاضوں کے مطابق آئندہ بھی تبدیلی اور ترقی جاری رہے گی۔ ایسی صورت میں غیر مستقل رسموں اور عقیدوں کو اٹل اور ناقابلِ ترمیم قرار دینا اور انھیں ہی اصل مذہب قرار دینے کی ضد کرنا دینِ فطرت اور روحِ اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ جن باتوں کی ابتداء اور انتہا کا واضح علم نہ ہو انھیں اٹل روایتی عقاید کے حصار میں محدود کر دینا قانونِ فطرت (ارتقاء) سے ناواقفیت اور عقل کی خامی کی دلیل ہے۔ روایتی عقاید ہی کو اصلِ اسلام قرار دینے والے مفاد پرستوں کا ایک سوچا سمجھا مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان عوام الناس ان کی قیادت کی گرفت میں رہتے ہوئے انہی باتوں میں الجھے رہیں اور ان کے استحصال کے شکنجوں سے آزاد نہ ہونے پائیں۔ اپنی اس بے جا غرض میں انھیں اس بات کی بھی کوئی پرواہ نہیں رہتی کہ اس طرح اسلام کی عظمت و وقعت بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے۔

بلاشبہ اسلام کو "عالمی مذہب" کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے پیروکار کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اور دنیا کے تقریباً ہر حصّہ میں موجود ہیں۔ اس اعتبار سے ہندو مت، بدھ دھرم، عیسائیت اور کمیونزم کو بھی "عالمی" قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اسلام کو "عالمی مذہب" کہنے سے یہ مراد لی جائے کہ ساری دنیا کے لوگوں کی بہبود اور نجات صرف مفاد پرستوں کے تعبیر کردہ اسلامی عقاید و رسوم کے اختیار کرنے ہی کے ذریعہ ممکن ہے اور آخر میں کسی نہ کسی طرح ساری دنیا کے لوگوں کو یہ عقاید و رسوم اختیار کرنے ہی پڑیں گے۔ محض خود فریبی ہے ساتھ ہی اسلام کی حقیقی تعلیمات کے خلاف بھی۔

میں نے صفحاتِ گزشتہ میں جو کچھ بھی بیان کیا ہے اس کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ جملہ مذاہب عالم کی ابتدا میں اصل غرض و غایت ایک ہی تھی یعنی امن و اتحاد اور ترقی بنی آدم اسی طرح ان کے بیشتر عقاید و رسوم بھی ایک ہی جیسے تھے۔ مگر جوں جوں علاقائی ضروریات، طبقاتی مفادات اور ماحول میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ ان کے ظاہری رنگ اور خد و خال بدلتے گئے۔ اہلِ حق کے نقطۂ نگاہ سے یہ تبدیلیاں صرف ان عقائد و رسوم میں ہوتی آئی ہیں جن کی حیثیت صرف نمائشی رہی ہے۔ اور جو خاص طور پر جہلا اور روایت پرستوں کے لئے ہوتے ہیں۔ اہل حقیقت کے تئیں ان کی کبھی کوئی بنیادی اہمیت یا وقعت نہیں ہوتی۔ مذاہب کی اصل غایت اور ان سب کا مشترکہ نصب العین ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ اور وہ ان کی صداقت اور ابدیت پر پورا پورا اعتقاد رکھتے ہیں۔

قرآنِ پاک کی درج ذیل آیات مفاد پرستوں کی تنگ نظرانہ اسلامی تعبیر کی کھلی ہوئی مخالفت اور اہلِ حق کے نقطۂ نظر کی کھلی ہوئی تائید کرتی ہیں۔

۱۔ "یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک" اس آیت میں آنحضرت صلعم سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: "اہلِ ایمان وہ ہیں جو اس پر جو تم پر نازل کیا گیا اور اس پر جو تم سے پہلے والوں پر نازل کیا گیا اس پر ایمان لاتے ہیں۔" یعنی خدا کی نظر میں سچا مسلمان وہی ہے جو سابقہ پیغمبروں پر نازل کی ہوئی کتب اور ہدایات اور قرآن پاک میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ اگر ان کے مابین اختلاف ہوتا تو ان پر ایمان لانے کی ہدایت ہرگز نہ دی جاتی۔

۲۔ اِنَّ الّذین آمنوا والّذین ھادوا والنصارا والصابئین من آمن باللہ، والیوم الآخر وعمل صالحاً فلھم اَجرھُم عند ربّھم ولاخوفٌ علیھم ولاھم یحزنون، "یعنی مسلمانوں، یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں میں سے جو بھی اللہ پر اور یوم الآخر (اچھے مستقبل) پر ایمان رکھتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں ان کو خدا کی طرف سے اجر ملے گا اور وہ نجات پائیں گے" اہلِ حقیقت کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اس بات پر ایمان ہو کہ یہ کائنات ایک منصوبہ کے تحت خلق کی گئی ہے اور اللہ اس کا منتظم اور خالق ہے۔

یوم الآخر پر ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ارتقاء اور خوشگوار مستقبل پر اعتماد رکھا جائے اور اسے تعمیر کرنے کے لیے عمل کیا جائے۔ اور عمل صالح سے مراد بنی نوع انسان کے اتحاد امن اور ترقی کی کوششیں ہیں۔

۳۔ "آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون۔ کل آمن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسولہ لانفرق احد من رسلہ۔" "یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور سچے مسلمان اس بات پر ایمان رکھتے ہیں جو کہ ان پر نازل ہوئی ہے۔ یہ سب لوگ اللہ تعالیٰ اس کے ملائکہ اس کی کل کتابوں اور رسولوں کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان سب کی تعلیمات میں کوئی اختلاف اور تضاد نہیں ہے۔"

اس آیت سے واضح طور پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ مختلف رسولوں اور کتابوں کے پس منظر میں حقیقی وحدت کارفرما رہتی آئی ہے اور اس سے ادیان کے دین فطرت (قانونِ ارتقاء) کے مطابق ہونے پر اعتقاد رکھنا لازمی قرار پاتا ہے۔ اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ چند نمائشی اعتقادات و رسوم کو بنیاد بنا کر مفاد پرستوں کے دعوے کے مطابق دیگر مذاہب کی اصل غایت کو اسلام کے برعکس یا متضاد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور اگر ایسا کیا جائے تو وہ اسلام کی روح کے منافی ہوگا۔

مفاد پرستوں کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ ان کا تشریح کردہ اسلام نوعِ انسانی کے جملہ مسائل کا حل رکھتا ہے اور مکمل فلسفۂ حیات ہے

اس دعوے کی اصل حقیقت پیش کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ دو اہم سوالات کے جواب دوں:-

(الف) نوعِ انسانی کے وہ مسائل کیا ہیں جو اسلام کے ذریعہ حل ہو سکتے ہیں؟

(ب) اسلام کون سا مکمل فلسفۂ حیات پیش کرتا ہے؟

(الف، نوعِ انسانی کے مسائل :- ان کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک بنیادی مسائل دوسرے فروعی مسائل ۔

بنیادی مسائل :- ہر دور اور ہر علاقہ کے انسانوں کے لیے باہمی نفرت و نفاق خوف و بدامنی ۔ جہالت اور وہم پرستی اور غربت و افلاس کے مسائل بنیادی اہمیت رکھتے آئے ہیں ۔

اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اسلام ان مسائل کا صحیح حل پیش کر سکتا ہے تو مفاد پرستوں کے تشریح کردہ اسلام سے ہرگز ان کا حل ممکن نہیں ۔ ہاں اہلِ حقیقت اور صوفیائے کرام کے تشریح کردہ اسلام سے بیشک ان مسائل کا صحیح حل تلاش کیا جا سکتا ہے ۔ مفاد پرستوں کا تشریح کردہ اسلام تو ان مسائل کو پیدا کرنے انھیں الجھانے اور انھیں ترقی دینے کا کردار انجام دیتا ہے ۔ نہ صرف دوسرے انسانوں بلکہ خود مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف تعصب و تنگ نظری کی فضا پیدا کرنے اور کٹر فرقہ پرستی اور گروہ بندیوں کو جنم دینے کا باعث وہی ان کی من مانی اسلامی تشریح ہے ۔ جسے اصل اسلام قرار دینے اور دوسرے سب کو جہنمی اور گردن زنی ٹھہرانے کے لئے ان کے عطیات اور چندوں پر پرورش پانے والے مُلّا دن رات واویلا مچائے رہتے ہیں ۔ مفاد پرستوں کا حقِ نمک ادا کرنے کی خاطر وہ اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو دنیا میں تشدد اور جہاد کے ذریعہ فنا کر دینے اور عاقبت میں جہنم کا ایندھن بنانے کی دھمکیاں دے کر نفرت و اشتعال کو ہوا دیتے ہیں ۔ نمائشی رسوم و عقاید کی پابندیوں پر زور دے کر خدا اور رسول کے نام پر وہ لوگوں کو علم و عقل کی راہ اختیار کرنے سے منع کرتے ہیں ۔ مغرب کی ایجاد کردہ ہر شے کو پہلے ناجائز قرار دے کر استعمال کرنے پر تو آمادہ ہو جاتے ہیں مگر جو علوم ان ایجادات کو جنم دینے کا سبب بنتے ہیں مسلمانوں کے لیے انھیں حرام اور غیر اسلامی قرار دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ ۔ بھلا ایسے ذہن کے لوگوں کا تشریح کردہ اسلام سوائے ان کے اور ان کے آقاؤں کے ذاتی مسائل کے جملہ مسلمانوں اور کل بنی نوعِ انسان کے اجتماعی مسائل کو کس طرح حل کر سکتا ہے ؟ یہ اپنی نااہلی چھپانے کے لیے کہتے ہیں کہ ان کا اسلام اسی وقت مسائل کا حل پیش کر سکتا ہے کہ جب

سارے لوگ ان کے عقیدہ کے پیرو ہو جائیں ۔ گویا مسائل بغیر مذہبی عقیدہ تبدیل کئے
حل نہیں کئے جا سکتے ۔ چاہے انسانیت تباہ ہو جائے ۔

ع اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے ۔

بدلتے ہوئے حالات میں ہر ملک و قوم اور زمانہ میں نت نئے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے جن کے حل کے لئے عقل اور حالات کے تقاضوں کا خیال رکھنا پڑے گا ۔ امرت دھارا کی طرح ایک ہی دوا ہر مرض کے علاج کے لیے تشخیص کرنا ہٹ دھرمی یا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ غربت اور افلاس ہی کے مسئلہ کو لیجئے مفاد پرستوں کے اسلام میں زکوٰۃ ۔ خیرات اور سود ختم کرنے علاوہ اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں حالانکہ آج کے دور کی معاشیات کا عہد اسلام کے دور کی معاشیات سے کوئی نسبت ہی نہیں اور اُس دور اور آج کی مدنی اور سماجی زندگی میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث آیندہ کے صفحات پر پیش کی جائے گی ۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ زمانہ حال کے تقاضوں اور خصوصیات کو یکسر نظر انداز کرکے جو لوگ بھی مفاد پرستوں کے تشریح کردہ اسلام کو نوع انسانی کے جملہ مسائل کا حل اور مکمل فلسفہ حیات قرار دیتے ہیں ۔ یا تو وہ جان بوجھ کر دوسروں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں یا جہالت اور تعصب کے اتنے دبیز پردے ان کی آنکھوں پر چڑھے ہوئے ہیں کہ وہ اور کچھ دیکھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے ۔

غور اور تجزیہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ مفاد پرستوں کی اسلامی تشریح ایک خاص قسم کے نظریہ کو جنم دیتی ہے اور یہ نظریہ ۔

- ڈکٹیٹر شپ کا رجحان پیدا کر کے جمہوریت کے خاتمہ کا باعث بنتا ہے ۔
- انسانوں کے مابین مذہبی اور فرقہ واری تعصب ابھار کر باہمی نفرت و نفاق کی فضا پیدا کرتا ہے ۔
- فوق العقل باتوں کو بنیاد بنا کر ہر عقلی اور سائنسی تفتیش کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے ۔
- مخالف عقیدہ اور نظریہ کے لوگوں کے خلاف تشدد اور جہاد کی تلقین کر کے

بدامنی کی فضا کا باعث بنتا ہے۔

- ذاتی ملکیت کی چھوٹ کا محافظ بن کر عوام کی غربت وافلاس دور کرنے کی تجویزوں کے آڑے آتا ہے۔
- وحشیانہ دور کے رسوم وعقاید کو اصل دین قرار دے کر عوام کے ذہن وفکر کو نمائشی باتوں میں الجھائے رکھنا چاہتا ہے۔
- مسلمانوں کو فرضی برتری اور دنیا کی امامت کا جھوٹا خواب دکھا کر ان میں فسطائیت کے جذبات ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔
- رسمی باتوں کو بنیادی قرار دے کر اسلام کی اصل غایت کو ذہنوں سے فراموش کر دیتا ہے۔
- دینِ فطرت یا قانونِ ارتقاء کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے روایت پرستی کے رجحان کو تقویت پہونچاتا ہے۔
- رواداری اور انسانی احترام کے جذبات ختم کر کے تنگ نظری اور تنگدلی کی کیفیات پیدا کر دیتا ہے۔

فروعی مسائل :- اس قسم کے مسائل علاقائی اور جغرافیائی خصوصیات کی بنا پر مختلف ماحول میں مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً سرد ممالک کی مشکلات ومسائل گرم ممالک سے مختلف ہوں گے۔ قطبین کے نزدیک کے ممالک کے دن رات بہت طویل ہوتے ہیں۔ اور مصنوعی سیاروں میں گردش کرنے والوں کے بیحد مختصر ایسی حالتوں میں بارہ اور چودہ گھنٹوں کی بنیاد پر بنے ہوئے معینہ پروگرام پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً پانچ وقت کی نمازیں اور ایک ماہ کے روزے کی پابندی ان علاقوں میں دشوار ہو جائے گی جہاں ۲۴ گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ وقت تک نہ سورج طلوع ہوتا ہے نہ غروب، مصنوعی سیارول کے لئے تو یہ بات اور بھی زیادہ دلچسپ ہوگی کیونکہ ان کے دن اور راتیں صرف آدھ آدھ گھنٹہ کی ہوتی ہیں۔ آدھ گھنٹہ میں دن کی تین نمازیں اور بقیہ آدھ گھنٹہ میں رات کی دو نمازیں کس طرح نپٹائی جائیں گی اور آدھ گھنٹے کے روزے کے کیا معنی ہوں گے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زمان ومکان اور حالات کے مطابق مسائل بھی مختلف ہوتے

ہیں۔ چنانچہ ان کا حل بھی مختلف ہی ہونا چاہیئے۔ ہر جگہ کے لیئے ایک ہی اصول یا فارمولا کام میں نہیں لایا جا سکتا۔

یہی صورت مختلف ادوار و مقامات کے تمدنی حالات سے بھی لاگو ہوتی ہے۔ انسان کے دور وحشت کے حالات اور ان کے تقاضے مختلف تھے۔ لوگ منتشر صورتوں میں درختوں کے تنوں، کھوکھوں اور پہاڑوں کے غاروں اور کھوہوں میں ننگ دھڑنگ رہا کرتے تھے۔ آگ، اسلحہ اوزار اور زراعت وغیرہ سے قطعی بے خبر تھے۔ ہر روز خوراک تلاش کرنے، جنگلی درندوں سے محفوظ رہنے، سماوی آفات کے سامنے بے بس ہونے اور مستقل رہائش اور وجہ معاش نہ ہونے کی وجہ سے انھیں ہر وقت وہم و خوف میں زندگی گزارنی پڑتی تھی۔ ان حالات کے مطابق خود کو کسی حد تک مطمئن کرنے کے لیئے انھوں نے بعض عقاید و رسوم ایجاد کر لیئے تھے۔ اس دور کے بعد ترقی کرتے کرتے انسان بدویانہ زندگی میں داخل ہوا۔ اس دور میں دودھ اور گوشت کی خوراک کیلیئے انھوں نے مویشی پالنا شروع کیئے۔ اس سلسلہ میں چراگاہوں کی تلاش اور باہمی تصادم کے جو مسئلے انھیں درپیش آئے اس کے حل کے لیئے انھوں نے قبیلہ داری اجتماعی زندگی اختیار کی۔ اس دور کی زندگی کے مسائل واضح طور پر دور وحشت کے مسائل سے مختلف تھے۔ رفتہ رفتہ لوگ خانہ بدوشی کی اس زندگی سے بھی تنگ آ گئے اور دریاؤں کے کنارے مستقل طور پر آباد ہونے لگے۔ اسی دور میں انھوں نے زراعت سے واقفیت حاصل کی۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں بسائیں اور رہائش کے لیئے جھونپڑیاں تعمیر کیں۔ اس دور میں جنگلات کو صاف کرنا، زمینوں کو زیر کاشت لانا۔ اناج جمع کرنا، موسمی تغیرات کا مقابلہ کرنا اور اپنی بستی، مویشی اور زراعت کی حفاظت کرنا ان کے خصوصی مسائل تھے۔ جس کے حل کے لیئے انھیں بدویانہ زندگی سے مختلف طریقے اور دستور اختیار کرنے پڑے۔ اب اگر اس دور کے بعد انسانی معاشرہ بتدریج تجارتی، شہری اور سائنسی دور میں آ چکا ہو تو کیا اس دور کے مسائل زراعتی دور سے مختلف نہ ہوں گے اور ان کے حل کے لیئے نئے حالات کے تقاضوں کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیئے؟

لیکن اگر اس کے باوجود یہ کہا جائے کہ مفاد پرستوں کا تشریح کردہ اسلام اور اس کے روایتی عقاید و رسوم ہر دور کے ہر مسئلے کا حل ہیں تو اسے جہالت یا خود فریبی کے علاوہ اور کیا کہا جائیگا؟ زندگی کے فروعی مسائل زمانے اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق ہمیشہ بدلتے آئے ہیں اور آئندہ بھی تبدیل ہوتے رہیں گے ان کا حل ماحول کے تجربات اور عقل کی بنیادوں پر ہی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ فروعی مسائل کے جو ضابطے تیرہ سو برس پہلے کی تمدنی زندگی کے مطابق بنائے گئے تھے۔ انھیں آج یا آئندہ کی تمدنی زندگی پر لاگو کرنے کی ضد کرنا اسلام کے ازلی اور ابدی وقار کے منافی ہے۔ جس طرح ہر مرض کی دوا جدا اور مریض کی حالت کے مطابق ہوتی ہے اسی طرح ہر مسئلہ کا حل بھی مختلف اور ماحول کی ضرورت کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر ملک اور زمانہ کے مسائل کے لئے ہمیشہ کے واسطے ایک حل طے کر لینا قدرت کی لامتناہی اور گوناگوں نیرنگیوں سے انکار کے مترادف ہے۔

اس باب میں سب سے زیادہ شور شریعت اور سنّت کی پیروی کے نام پر مچایا جاتا ہے۔ حالانکہ خود آنحضرت صلعم کے قول و فعل سے ایسی کتنی ہی باتیں ظاہر ہوتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ دنیاوی امور اور بعض روایتی عقاید کے بارے میں آپ لوگوں کو اپنی اپنی فہم اور تجربات کے مطابق عمل و خیال قایم کرنے کو پسند فرماتے تھے۔

مثال کے طور پر ایک بار آپ سے کسی نے قیامت (یوم الآخرت) کے بارے میں استفسار کیا۔ آپ نے صاف صاف جواب دیا مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اگر آپ کسی ملاّ سے یہ سوال کریں تو وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اس کا قدیم دیو مالائی تصوّر اتنی تفصیل سے بیان کرے گا جیسے خود دیکھ کر آیا ہو۔ حالانکہ اس کی ساری داستان عقل کی کسوٹی پر پرکھنے سے بالکل بے سر و پا ثابت ہوگی۔ فی الواقعہ یوم الآخر سے مراد انسان اور دنیا کا طے شدہ خوشگوار اور بہتر مستقبل ہے۔ یہ معنی میرے ایجاد کردہ نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے جیّد عالم، محقق، فیلسوف شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی کی توضیح کے مطابق ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ "آخرت جسے کہتے ہیں وہ ہمیشہ بنتی رہتی ہے۔ دنیا کا مکمل خاتمہ نہ ہونے والا ہے نہ اس کی کوئی حد مقرر ہے۔ جس کو آخرت کہا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ یہ دنیا اور وہ دنیا صرف وقت اور زمانے کے

تحت پیدا ہونے والے نئے مظاہر کے مختلف نام ہیں۔ اور تبدیلیٔ اشکال کے مظہر ہیں ایک شکل گم ہو جاتی ہے دوسری شکل وجود میں آجاتی ہے۔ یہ تبدیلی ہمیشہ جاری رہے گی۔ کل کی آخرت آج ہے اور آج کی آخرت کل ہوگی۔"

آنحضرت صلعم نے اس سوال کا جو جواب عنایت فرمایا ہے اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آپ اس رسمی عقیدہ کے بارے میں اپنی جانب سے کوئی پیشگوئی نہ فرمانا چاہتے تھے اور اسے لوگوں کی فہم پر چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

اسی طرح ایک دوسری مستند روایت ہے کہ ایک بار آپ کھجوروں کے ایک باغ سے گزرے۔ اس وقت باغبان نر کھجوروں کے پھولوں کو مادہ کھجوروں کے پھولوں پر ڈال رہے تھے۔ آپ نے انھیں منع کیا۔ اور فرمایا "قدرت یہ کام خود انجام دے گی"۔ باغبانوں نے اس ہدایت کی تعمیل کی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اس برس کھجوروں میں بہت کم پھل آئے۔ جب آنحضرت کو یہ بات بتائی گئی تو آپ نے فرمایا "آئندہ تم اپنی خواہش اور تجربات کے مطابق پھول ڈالا کرو۔ میرا کام رسالت ہے۔ ہر بات میں دخل اندازی میرے لئے مناسب نہیں۔"

اس مثال سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مخصوص شعبوں میں آپ ماہرین کی رائے کو اہمیت دیتے تھے اور انھیں آزاد چھوڑنا بہتر تصور فرماتے تھے۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ آپ نے دو حیثیتوں سے اپنے فرائض انجام دیئے ہیں۔ ایک سیاسی و سماجی منتظم کی حیثیت سے دوسرے پیغمبرِ خدا کی حیثیت سے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے بارے میں دو جدا رائیں دی ہیں۔ جب وہ سیاسی منتظم کی حیثیت سے کام کرتے تھے تو فرماتے تھے۔ "میں تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہوں"۔ یہ کہہ کر گویا آپ اس بات کا اعتراف فرماتے تھے کہ بشری خوبیاں اور خامیاں ان سے سرزد ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ اس حیثیت میں عام آدمی کی طرح وہ خود کو عبد (بندہ) قرار دیتے تھے اور گناہوں سے محفوظ رہنے کی دعائیں مانگتے تھے۔ دوسری حیثیت میں وہ "فقاب قوسین او ادنیٰ" کی عظمت کے ساتھ صاحبِ معراج ہونے کا دعویٰ فرماتے تھے۔ اس حیثیت میں وہ "احمد بلا میم" بھی ہوتے اور "مدینۃ العلم" بھی۔ لہٰذا دونوں حیثیتوں کو گڈمڈ کرنا حقیقت کے

خلاف ہے۔

اس نکتہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آنحضرت صلعم یا قرآن پاک نے وقتی یا فروعی مسائل کے متعلق اُس دور کے تمدنی حالات کے مطابق جو مثالی ہدایات دی ہیں وہ دائمی حکم کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ تمدنی حالات کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے جوافادیت کہ ان ہدایات سے وابستہ تھی وہ معدوم ہو چکی ہے۔ انھیں ہر دور اور حالات کے لئے اٹل قرار دینا روحِ اسلام، قانونِ فطرت اور منشائے احمدی کے خلاف ہوگا۔

مفاد پرستوں کے تشریح کردہ اسلام کے دعوے کی مزید کوتاہی معلوم کرنے کیلئے بہتر ہوگا کہ ہم اپنے دور کے اہم مسائل کو سامنے لائیں۔ اور دیکھیں کہ ان مسائل کا کوئی صحیح حل ان کے پاس موجود بھی ہے کہ نہیں۔ میرے خیال میں دورِ حاضرہ کے اہم مسائل جو نوعِ انسانی میں انتشار اور بدامنی کا باعث ہیں حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ آمریت ۲۔ غربت و افلاس ۳۔ طبقاتی مفاد ۴۔ جبر و تشدد

۱۔ آمریت یا ڈکٹیٹری:۔ بنی نوع انسان نے تاحال جتنے بھی نظامہائے حکومت کا تجربہ کیا ہے آمریت کا نظام ان میں سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا ہے۔ دورِ حاضرہ میں جیسے جیسے تباہ کن ایٹمی ہتھیار اور سائنسی آلاتِ جنگ میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، رسل و رسائل اور آمد و رفت کے ذرائع برق رفتاری اختیار کرتے جارہے ہیں اور دنیا کے سارے ممالک بڑی متحارب طاقتوں کے گرد ہول میں شامل ہوتے جارہے ہیں ویسے ویسے آمریت کے رجحانات کی خطرناکی بڑھتی جارہی ہے۔ اس زہریلے رجحان کو صرف رواداری اور برداشت کی گنجائشوں اور انسانیت اور آزادیٔ رائے کے احترام کے ذریعہ ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ صفات کسی ایسے نظریہ کے پیروؤں میں پیدا ہوسکتی ہیں جو تنگ نظری، تعصب اور انتہا پسندی پر مدار رکھتا ہو؟

آمریت یہ ہے کہ کسی خاص طبقہ۔ گروہ۔ رنگ۔ نسل۔ مذہب۔ فرقہ یا عقیدہ کے کچھ افراد اپنے مخصوص نظریہ حیات یا سیاسی و سماجی نظام کو سب کی بہتری کے لئے حرفِ آخر قرار دیں۔ اور اس بارے میں دوسروں کی عقل و فہم اور معلومات کو ناقص

ٹھہراتے ہوئے انھیں اپنا نظریہ قبول کرنے پر مجبور کریں۔ نہ کسی کو اختلافِ رائے کا حق دیا جائے نہ کسی قسم کے بحث و مباحثہ کو گوارا کیا جائے۔ قیادت اور اقتدار پر مخصوص فرد یا افراد کی اجارہ داری قائم ہو جائے اور دوسروں پر ان کی ہر بات کی تائید و حمایت فرض بنا دی جائے۔ وغیرہ وغیرہ

اب ذرا اس روشنی میں مفاد پرستوں اور ان کے مبلغین کے نظریات، جذبات اور طرزِ عمل پر سرسری نگاہ ڈالیے۔ کیا وہ اپنے تشریح کردہ نظریۂ اسلام کو دین اور دنیا کا واحد درست نظریہ قرار دیتے ہوئے دوسرے سارے نظریوں کو باطل اور ناقابلِ برداشت نہیں ٹھہراتے؟ کیا وہ سیاسی اختلافِ رائے رکھنے والوں کے خلاف ہر ممکن اوچھے ہتھکنڈے سے کام لیتے ہوئے مذہبی دہشت گردی کی فضا نہیں پیدا کر رہے ہیں؟ کیا انھوں نے اسلام، قرآن اور حدیث کی تشریح پر بزعم خود اپنی اجارہ داری نہیں قائم کر لی ہے؟ — آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کے ہر سوال کا جواب آپ کو "ہاں" میں ہی ملے گا۔ اور یہ بات اس حقیقت کا کھلا ہوا ثبوت مہیا کرتی ہے کہ ان حضرات کا نظریہ ان کے جذبات اور ان کا طرزِ عمل سب آمریت کے زعمِ باطل سے سرشار ہے۔

اسلام کی صحیح تعلیمات کے مطابق آمریت ہر صورت میں غلط اور نقصانات کا باعث ہے۔ اس تعلیم کے مطابق انسان زمین پر خدا کا نائب ہے اور سارے انسان مساوی طور پر آزاد اور بھائی بھائی ہیں۔ انتظامی ذمہ داریاں مختلف ہو سکتی ہیں مگر اس کی وجہ سے نہ کوئی مستقل حکمراں بن کر امتیازی اور زائد انسانی حیثیت کا حقدار ہو جاتا ہے نہ کوئی مستقلاً محکوم اور کمتر انسان ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبرِ خدا اور مسلمانوں کے سربراہِ اعلیٰ ہونے کے باوجود رہائش، پوشش اور نشست و برخاست وغیرہ میں کسی قسم کا حاکمانہ کروفر نہ رکھتے تھے۔ عام لوگوں جیسی سادہ زندگی گزارتے تھے عام لوگوں میں بیٹھتے اٹھتے تھے، اور ان کے ہر طرح کے استفسارات کا نرمی اور آہستگی سے جواب دیتے تھے۔ اور انسانیت کا احترام اس درجہ ملحوظ رکھتے تھے کہ کسی بدو کا بھی اپنی تعظیم کے لیے اٹھنا پسند نہ فرماتے تھے۔ لاریب آپ نے انسانوں کو کمتر و برتر

بنانے والی نسل ورنگ قوم قبیلہ اور فرقہ و عقیدہ کی جاہلانہ قدروں کا خاتمہ کیا، انسانیت و مساوات کا درس دیا۔ اتحاد، امن اور ترقی بنی آدم کی راہیں ہموار کیں اور باہمی صلاح و مشورے کے ذریعہ اجتماعی معاملات طے کرنے کا پیغام عطا کیا۔

صوفیائے کرام نے اسلامی تعلیم کا یہی اصل پہلو اجاگر کیا ہے۔ مگر چونکہ اس سے مفاد پرست طبقہ کی دکھتی رگوں پر چوٹ پڑتی ہے۔ اس لیے انھیں خدا، رسول، قرآن اور اسلام کا باغی ٹھہرا کر سزائیں دی گئیں۔ دورِ حاضرہ کے ڈکٹیٹر بھی اسی طرح آزاد خیال لوگوں کو ملک و قوم کی مخالفت کا بہتان لگا کر سزائیں دیتے ہیں۔ مگر کیا خوب فرمایا ہے شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمتہ نے "فَکَّ کُلِّ نظامٍ" یعنی سارے فرسودہ نظاموں کو ختم کر کے عقل کے مطابق نئے راستے اختیار کرو۔

غرض مفاد پرستوں کی اسلامی تشریح خود ہی آمریت کی حامی ہے بھلا معاشرہ کو آمریت کے خطرات سے نجات دلانے کے لیے اس سے کیا امید کی جا سکتی ہے؟

۲۔ **غربت وافلاس**:- دورِ حاضرہ میں دنیا کی کثیر آبادی کی غربت وافلاس کا مسئلہ انتہائی سنگین نوعیت رکھتا ہے۔ دیگر ممالک سے قطع نظر اگر پاکستان ہی میں دیکھا جائے تو یہاں کی آبادی کا بیشتر حصہ مناسب غذا، لباس، رہائش، علاج اور روزگار سے محروم ہے۔ زندگی کی بنیادی ضرورتیں اور آسائشیں ان کے لیے حرام ہیں۔ اور ملک کی کل پانچ فیصد آبادی خوشحال ہے۔

مفاد پرستوں کی اسلامی تشریح کے مطابق اس مسئلہ کا صرف یہ حل پیش کیا جاتا ہے کہ سود کا کاروبار ختم کر دیا جائے اور اہلِ حیثیت کو زکوٰۃ اور خیرات دینے کا عادی بنایا جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان ذرائع سے اتنی آمدنی ہو سکتی ہے کہ ملک سے افلاس دور کر کے ہر شخص کو روٹی۔ کپڑا۔ مکان۔ علاج اور تعلیم وغیرہ کی بنیادی سہولتیں فراہم کی جا سکیں؟ جواب نہیں اور صرف نہیں میں ہوگا۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی ہوئی بات نہیں کہ زکوٰۃ روپے۔ سونے۔ چاندی۔ اور مویشیوں پر مقرر کی جاتی ہے یعنی ملکیت پر، آمدنی پر نہیں۔ نقد روپے آج کل گھروں میں

کوئی نہیں رکھتا یا تو بینکوں میں جمع کرتے ہیں یا تجارت اور کارخانوں میں لگاتے ہیں۔ بینک اپنے یہاں جمع ہونے والی رقوم کو تجارت اور کارخانوں کے کاروبار کے لیے سود پر قرض دیتے ہیں۔ سود ختم ہو جانے کی وجہ سے نہ لوگ بینکوں میں روپیہ رکھیں گے اور نہ ہی بینک دوسروں کو قرض دے سکیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ کاری رک جائے گی کارخانے اور نئے کاروبار قایم نہ ہو سکیں گے۔ اور ملک اقتصادی بدحالی کا شکار ہو جائے گا۔

موجودہ دور میں دنیا میں دو طرح کے اقتصادی نظام رائج ہیں ایک سرمایہ دارانہ نظام دوسرا اشتراکی نظام۔ سرمایہ دارانہ نظام میں بینکوں۔ کارخانوں اور بڑے بڑے نجی تجارتی اداروں کا وجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے چند لوگ انتہائی دولت مند ہو جاتے ہیں۔ اور اکثریت غریب ہو جاتی ہے۔ اشتراکی نظام میں ذاتی ملکیت کا تصور ختم کر دیا جاتا ہے اور پیداوار اور ذرائع پیداوار کا سارا نظام جماعت کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور ہر فرد کی رہائش۔ خوراک۔ لباس۔ تعلیم۔ علاج اور روزگار وغیرہ کی ذمہ داری حکومت کے سر ہو جاتی ہے۔ اسلام ان دونوں اقتصادی نظاموں کی مخالفت کرتا ہے۔ ایک طرف وہ ذاتی ملکیت کو ختم کرنے کے خلاف ہے اور دوسری طرف سود ختم کر کے اصل زر کا صرف ڈھائی فیصد وصول کرنے کا حکم دیتا ہے جس کو خرچ کرنے کے لیے بھی کچھ پابندیاں عاید کرتا ہے۔

آجکل کی حکومتوں کا کاروبار پہلے سے بے اندازہ بڑا اور وسیع ہو چکا ہے۔ اسے چلانے کے لیے بڑی بڑی رقموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ رقمیں مختلف چیزوں پر ٹیکس عاید کر کے وصول کی جاتی ہیں۔ اب اگر لوگ یہ ٹیکس بھی ادا کریں۔ سود بھی ختم کر دیا جائے اور ہر سال اصل زر کا صرف ڈھائی فیصد ادا کیا جائے تو موجودہ تمدن کا کاروبار تو چوپٹ ہو جائے گا اور لوگوں کو پھر بدویانہ دور میں پلٹنا پڑے گا۔

جہاں تک خیرات کا معاملہ ہے اسے ہرگز حساب میں نہیں شمار کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ محض رضاکارانہ فعل ہے نہ اس کے لیے کوئی ضابطہ بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس پر

حل کرایا جاسکتا ہے۔ بہرحال یہ سرسری تجزیہ اس بات کو قطعی طور پر واضح کرتا ہے کہ ملک کی اکثریت کے غربت و افلاس کو دور کرنے کا مفاد پرستوں اور ان کے تشریح کردہ اسلام کے پاس کوئی ٹھوس اور جامع پروگرام نہیں اور وہ اس مسئلہ کو خاطر خواہ طور پر حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

۳۔ **طبقاتی مفاد**:۔ تیسرا مشکل مسئلہ جو اس وقت دنیا کے سامنے ہے وہ مفاد پرست طبقہ Vested Class Interest کی جانب سے کیے جانے والے استحصال Exploitation کا ہے۔ اس طبقہ میں سرمایہ دار۔ ان کے چند ول اور عطیات پر پلنے والے مذہبی رہنما۔ سامراجی اور ان کے ایجنٹ شامل ہیں۔ یہ لوگ ملک کی حکومت۔ قیادت۔ دولت۔ پیداوار اور اس کی تقسیم کے ذرائع کو گھما پھرا کر اپنے ہی زیرِ تصرف رکھنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کی وجہ سے اکثریت انتشار اور افلاس میں مبتلا رہتی ہے۔ اس صورتِ حال کو برقرار رکھنے کے لئے استحصالی طبقہ انفرادی آزادی اور مذاہب کو اپنا نعرہ اور حربہ بناتا ہے۔ ظلم کی حمایت میں استعمال کیے جانے والے انہی نعروں کے ردعمل کے طور پر ہی روس اور کئی دوسرے ممالک میں لوگ مذہب اور انفرادی آزادی کی دھاندلی گردیوں سے بیزار ہو گئے۔ اس وقت دنیا میں پاکستان ہی وہ واحد ملک ہے جہاں مذہبی دھاندلی گردی زوروں پر ہے اور اسلام کی غلط تشریح کو صحیح اسلام کے نام پر مڑھنے کی دلیرانہ کوششیں کی جارہی ہیں۔ عوام کی سادگی اور اسلام سے محبت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے نعرہ کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا گیا ہے اور طبقاتی مفاد کا الو سیدھا کرنے کے لئے اسلامی نظام۔ اسلامی آئین۔ اسلامی تعلیم ــــ اسلامی قیادت اور اسلامی معاشرت وغیرہ وغیرہ کے جذباتی مطالبات کی اوٹ میں عوام اور ملک کی بہبودی و ترقی چاہنے والے عناصر کے خلاف مذہبی اشتعال انگیزی کی مہم چلائی جارہی ہے۔

بلاشبہ پاکستان اسی نعرہ کے تحت وجود میں لایا گیا ہے لیکن باوجودیکہ بانی پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناح اپنی ۱۱ اگست ۴۷ء کی تقریر میں آئندہ کے لیے اس کی طرز

کو ختم قرار دے چکے ہیں آج بائیس برس بعد پھر اسے ملانوں ہی کے خلاف زندہ کیا جا رہا ہے ۔ اور ملک کو مذہبی بنیادوں پر چلانے کی گفتگو کی جا رہی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی اس نعرہ کے ماحصل کا پھل ملک کے عوام کے بجائے صرف نوکرشاہی، کارخانہ داروں ۔ تاجروں، زمینداروں اور ان سب کے چندہ اور عطیات پر پرورش پانے والے ملاؤں ہی کو مل سکتا ہے ۔ سچ کہا ہے حضرت سچل سرمست نے ۔

جيسين منبر مسجد، مناري ويران نہ ٿيسن،
حال حقاني ميان سچو، حاصل نہ ٿيوي!

" یعنی جب تک مساجد کے منبروں سے اسلام کی غلط تعبیروں کا سلسلہ جاری رہے گا اس وقت تک اسلام کی اصل حقیقت عام نہ ہو سکے گی "

یہ تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ مفاد پرست اور انکا تشریح کردہ اسلام خود ہی طبقاتی لوٹ کھسوٹ کا حامی ہے اور پریشان حال دنیا کو طبقاتی استحصال سے نجات دلانے کا اس کے پاس کوئی حل نہیں ہے ۔

۴۔ **جبر و تشدد** :- موجودہ دنیا کا چوتھا اہم ترین مسئلہ جبر و تشدد اور دہشت انگیزی کا ہے ۔ بنی نوع انسان کے لیے یہ بات بیحد تشویشناک ہے کہ اختلافی اور نزاعی مسائل کو طے کرنے کے لیے معقولیت ۔ دلائل ۔ افہام و تفہیم گفت و شنید اور باہمی رضامندی کے طریقوں کو اختیار کرنے کے بجائے طاقت اور تشدد کے استعمال یا زعم سے کام لیا جائے ۔ جب تک دنیا میں یہ رجحان موجود رہے گا نہ کرۂ ارض کے ایٹمی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کا اطمینان کیا جا سکتا ہے نہ کسی ملک میں زیادہ عرصہ داخلی امن و سکون قائم رہ سکتا ہے ۔ انسان اپنی بیشتر صفات کی وجہ سے اشرف المخلوقات اور دوسرے حیوانات سے برتر قرار پاتا ہے لیکن بہیمیت وہ صفت ہے جو اسے حیوانوں کے ہم پلہ بلکہ بعض حیوانوں سے بدتر اور کمتر ثابت کرتی رہتی ہے ۔ طاقت اور دہشت گردی کی بنیاد پر کسی کو اپنی بات ماننے پر مجبور کرنا ایسا بہیمانہ اور وحشیانہ جذبہ ہے جس کے لیے تہذیب و شائستگی کے دائروں میں کہیں بھی کوئی گنجائش نہیں ۔ ہر دور

کے اچھے لوگوں نے اس جذبہ کو حقیر جانا ہے ۔ لیکن
انسان کے ماضی کی پوری تاریخ اس جذبہ کی تباہ کاریوں سے بھری ہوئی ہے
یہ واقعہ ہے کہ دور حاضرہ کا انسان جو مہیب قدرتیں حاصل کر چکا ہے اور انسانوں کی
کثیر آبادی جس طرح بڑے بڑے شہروں میں رہنے بسنے لگی ہے ۔ اس کے پیش نظر
آج کے انسان کا جذبۂ بہیمیت یا طاقت و تشدد کا استعمال ماضی سے ہزاروں گنا
زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے ۔

دنیا کے دو بڑے مذاہب کی بنیاد عدم تشدد یا اہنسا پر رکھی گئی ہے ۔ ایک ہندو
دھرم دوسرے عیسائیت اسی عقیدہ کی وجہ سے ہندو گوشت نہیں کھاتے ۔ ان کے بزرگوں
کا قول تھا کہ انسان تو انسان جانوروں کو ستانا بھی پاپ ہے ۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ان کے پیرووں
نے جبر سے کام لیتے ہوئے کروڑوں افراد کو اچھوت بنا دیا ۔ مہاتما گاندھی نے اہنسا
کے ذریعہ آزادی حاصل کی مگر ان کے آزاد دیس میں آج بھی ہندو ذرا ذرا سے بہانہ
پر فرقہ وارانہ فسادات برپا کر کے صدہا انسانوں کا خون بہاتے رہتے ہیں ۔

عیسائیوں کے لئے حضرت عیسیٰ کی تعلیم تھی کہ "اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ
لگائے تو تم دوسرا گال بھی اس کے سامنے پیش کر دو ۔" یعنی تشدد کے جواب میں بھی
تشدد نہ کرو اور صرف محبت اخلاق اور انسانیت کے ذریعہ مخالف کو اپنا بنا دو ——
سارا یورپ اور امریکہ حضرت عیسیٰ کے پیرووں سے بھرا ہوا ہے ۔ کیا واقعی وہ حضرت
عیسیٰ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں ؟ کیا یہ وہی لوگ نہیں جنہوں نے ساری دنیا میں
اپنے فوجی اڈے قائم کر رکھے ہیں ۔ آدھی سے زیادہ دنیا پر اپنا سامراجی تسلط نافذ
کر رکھا ہے ؟ اور کیا یہ وہی لوگ نہیں جن کی وجہ سے دو ایسی عالمگیر جنگیں ہوئیں
جن میں کروڑوں آدمی ہلاک اور کروڑوں معذور اور پراگندہ حال ہو گئے ۔ کیا یہ صحیح
نہیں کہ ان ہولناک تباہیوں کے اعتراف اور تہذیب و تمدن کے اونچے دعووں کے
باوجود تا حال وہ تشدد کے نظریہ اور استعمال سے باز نہیں آئے اور ادارۂ اقوام
متحدہ پر اعتماد کے اظہار کے باوجود اندھا دھند طور پر ہولناک ہتھیاروں کے ذخیرے

بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں؟ ان حالات میں امن و سلامتی کے مذاہب اسلام ہی سے کچھ نیک امیدیں وابستہ کی جا سکتی تھیں لیکن افسوس کہ مفاد پرستوں نے اسلام کو جو رنگ دے رکھا ہے اس سے وہ خود ہی تشدد کا حامی بلکہ داعی بن کر رہ گیا ہے۔ اس سلسلے میں مفاد پرستوں کی جانب سے جہاد کو جو معنی پہنائے گئے ہیں اس سے یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے نام پر اپنی رائے منوانے یا کسی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے تشدد کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ اس انتہاپسندانہ عقیدہ پر عمل کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو کتنی ہی شدید مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ لیکن صوفیائے کرام کے کھلم کھلا اختلاف کے باوجود مفاد پرست اور ان کے حواری اس عقیدہ کی اشتعال انگیز تبلیغ سے باز نہیں آئے۔

اسلام کے مقدس نام پر پاکستان میں مفاد پرستوں کی یہ سرگرمیاں شباب پر ہیں۔ چھوٹے صوبوں کو ان کے باشندوں کی مرضی کے خلاف ختم کرنا۔ جمہوریت کو پامال کرنا۔ عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹا کر جذباتی نعروں میں الجھا دینا۔ لوگوں کو انسانی حقوق سے محروم رکھنا اور مخالفین کو ختم یا دہشت زدہ کرنے کے لیے مذہبی جنون کی آگ بھڑکانا وغیرہ وغیرہ اس گروہ کے تئیں مقدس کارنامے ہیں۔

صوفیا کے مسلک یا صحیح اسلامی نظریہ کے مطابق اس قسم کی ساری جابرانہ حرکتیں دینِ فطرت کے خلاف بلکہ کفر ہیں۔ جبر و تشدد کینہ و نفاق پیدا کرتا ہے جبکہ اسلام محبت اور امن کی تعلیم دیتا ہے اور جارحیت یا زبردستی کو گناہ قرار دیتا ہے۔

مفاد پرستوں کے جبر اور دھاندلی کی یہ انتہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان بھی اسلام اور اس کے ارکان کے بارے میں ان کی پیش کردہ تشریح کو تسلیم نہ کرے یا اس سے اختلاف کا اظہار کرے تو وہ جواب میں اسے اسلام ہی سے خارج کر دیتے ہیں گویا اسلام دینِ الٰہی نہیں بلکہ ان کا کوئی ایسا ذاتی ادارہ ہے جس میں کسی کو شامل رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار انہی کے پاس ہے۔

صحیح اسلامی نظریہ اور صوفیانہ مسلک رکھنے والے بھی جہاد پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

لیکن ان کا عقیدہ مفاد پرستوں سے قطعی مختلف ہے۔ مفاد پرستوں کی طرح ان کا جہاد دوسروں کے حقوق غصب کرنے کے لئے اختلافِ رائے رکھنے والوں سے نہیں بلکہ خود اپنے نفس سے ہوتا ہے۔ وہ دشمن کو اپنے وجود سے باہر نہیں اپنے اندر تلاش کرتے ہیں۔ وہ خود غرضی، خود پرستی، اشتعال، تعصب اور نفرت کو اپنا اور اسلام کا دشمن سمجھتے ہیں، وہ ہر انسان میں خدا کا پرتو دیکھتا ہے اور جو برا کہلاتا ہے اس کو بھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

مفاد پرستوں کی اسلامی تشریح کے مطابق دین لوگوں کا اپنا معاملہ نہیں بلکہ اس میں مُلّا اور حاکم کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اسی تعبیر کے مطابق لوگوں کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور سماجی معاملات میں ملا اور حاکم مل کر دست اندازی کرنے لگتے ہیں۔ اور دین کو زندگی کے ہر مسئلہ پر حاوی قرار دے کر طبقاتی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر دیتے ہیں۔ اور عوام کے اُٹھنے، بیٹھنے، کھانے پینے، باہمی تعلقات اور ذاتی اعتقاد پر من مانی پابندیاں لگا کر ان کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔

مغربی ممالک اشتراکی نظام کے خلاف سب سے بڑی شکایت یہ کرتے ہیں کہ اس میں انفرادی آزادی قطعی طور پر سلب کر لی جاتی ہے۔ اور افراد کو سوسائٹی کی مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ لیکن شاید وہ نہیں جانتے کہ مفاد پرستوں اور ان کے چندوں پر پرورش پانے والے ملاؤں کے تشریح کردہ اسلام میں عام آدمی کی حالت اس سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اشتراکی ممالک میں لوگوں کی آزادی پورے معاشرہ کے اقتصادی مفاد کے نام پر محدود کی جاتی ہے لیکن نام نہاد اسلام میں یہی کام صرف ایک طبقہ کے مفاد کی خاطر کیا جاتا ہے۔ اشتراکی مملکت میں کارل مارکس کے نظریہ کی تشریح کمیونسٹ پارٹی کی اکثریت عقل، سماجی افادیت اور دلائل کی بنیاد پر کرتی ہے۔ لیکن مفاد پرستوں کے اسلام کی تعبیر کی اجارہ داری مخصوص افراد کو حاصل ہوتی ہے جن سے عقل کی بنیاد پر بحث یا اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

ان حقائق سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مفاد پرستوں اور ان

کے تشریح کردہ اسلام کے پاس دنیا کو جبر و تشدد کے چلن سے نجات دلانے کا کوئی حل نہیں بلکہ یہ دونوں امن و آشتی۔ رواداری۔ باہمی احترام اور گفت و شنید کے ذریعہ نزاعی یا اخلاقی مسائل کو طے کرنے کی راہ میں خود بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔

(ب) اسلام کونسا فلسفہ حیات پیش کرتا ہے :۔ سطور بالا میں جتنے بھی اہم نکات زیر بحث آچکے ہیں ان سے یہ بات سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ صحیح اور سچا اسلام جو فلسفہ حیات پیش کرتا ہے وہ اس سے قطعی مختلف ہے جو مفاد پرستوں کا تشریح کردہ اسلام پیش کرتا ہے۔ صحیح اسلامی تصورِ حیات نمائشی عقاید و رسوم رنگ و نسل اور ملک و ملت کے امتیازات سے بالاتر اور طبقاتی استحصال۔ جبر و تشدد۔ اور نفرت و تعصب کی آلائشوں سے پاک ہے۔ سلسلۂ ارتقاء سے اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں۔ بنیادی طور پر وہ مساوات و اتحاد اور امن و ترقی کی راہیں اپنانے کی دائمی ہدایت دیتا ہے اور دوسری ساری باتوں کا فیصلہ زمانہ و معاشرہ کے تقاضوں کے مطابق اہلِ علم و عقل کی صوابدید پر چھوڑتا ہے۔

مفاد پرستوں کا یہ دعویٰ کہ ان کا تشریح کردہ اسلام ہر دور و ہر مقام کی زندگی اور معاشرہ کے ہر شعبہ کے لئے واضح اور اٹل پروگرام رکھتا ہے، جس کی تعمیل کرانے کی خاطر انہیں فرد یا معاشرہ کے ہر معاملہ میں دخل و تصرف کا پورا حق حاصل ہے، زعم باطل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہٹ دھرمی اور دھاندلی گردی کا یہ رجحان اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔

مفاد پرستوں کا تیسرا دعویٰ

اسلام کی اپنے منشا کے مطابق توضیح کرنے والوں کا تیسرا اہم دعویٰ یہ ہے کہ قرآن پاک دنیا و آخرت کی جملہ معلومات و ہدایات کا منبع ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ

(الف) یہ خدا کی کتاب ہے   (ب) اس میں ہر دور و مقام کی زندگی کے ہر مسئلہ کے بارے میں ہدایت موجود ہیں۔

(الف) خدا کی کتاب :۔ "قرآنِ پاک خدا کی کتاب ہے"۔ اس کی تشریح میں ملاّ اور صوفی کے مابین بڑا فرق ہے۔ ملاّ اس بات پر زور دیتا ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے پاس تحریری طور پر تیار اور مکمل ہونے کے بعد آسمان سے جبریل امین کے ذریعہ وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا کر کے آنحضرت صلعم کو پہنچایا جاتا تھا۔ جسے آپ دُہراتے تھے اور اصحاب اسے تحریر یا حفظ کر لیتے تھے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ملاّ کے یہ خیالات خدا کے شخصی تصوّر پر مدار رکھتے ہیں اور یہ تصوّر غیر اسلامی اور دورِ جہالت کی یادگار ثابت ہو چکا ہے۔

آسمانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سات ہیں اور چھتوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر استادہ ہیں۔ جدید سائنسی تحقیق کے مطابق ایسے چھت جیسے آسمانوں کا کہیں وجود نہیں۔ خداوند پاک کا کسی ایک مخصوص مقام پر قرآن تحریر کرنے اور اسے ایک قاصد فرشتے کے ذریعہ آنحضرت صلعم کے پاس بھیجنے کے دنیاوی طریقوں کو اختیار کرنے کی باتیں بھی خدا کے اس تصوّر کے خلاف ہیں جس میں اسے بے مثال بے جسم۔ ہر جگہ حاضر ناظر اور ہر شے میں موجود مانا جاتا ہے۔

صوفیائے کرام کے نزدیک قرآن پاک وہ نعمت الٰہی ہے جو کیفیتِ وجدان میں حالات کے مطابق آنحضرت صلعم کی زبانِ مبارک سے براہِ راست نازل ہوتی رہی۔ ان کے تصوّر کے مطابق خدا لازمان و لامکان ہے وہم و قیاس سے بالاتر۔ ہر جگہ اور ہر شے میں موجود ہے۔ وہ اپنا حکم یا پیغام ظاہر کرنے کے لئے پہلے اسے لکھنے اور پھر قاصد کے ذریعے ... میں لانے کی مادی احتیاج سے قطعی بے نیاز ہے۔

(ب) مسائل اور حل :۔ ملاؤں کے دعوے کے مطابق قرآن پاک میں ہر دور اور مقام کی زندگی کے ہر مسئلہ کے بارے میں ہدایات موجود ہیں یعنی اس میں دورِ حاضرہ کی ریاستوں کی ضرورت کے مطابق آئین کا بھی مواد مل سکتا ہے اور معاشرہ

کی اقتصادی، سماجی، سیاسی، ہنری اور سائنسی رہنمائی بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ وہ جملہ علوم کا منبع ہے اور اب سے لے کر قیامت تک (بلکہ اس کے بعد بھی) نوعِ انسانی کو جتنے بھی انفرادی یا اجتماعی مسائل پیش آنے ہیں ان سب کا حل اس میں دیا ہوا ہے اسی دعوے کی بنیاد پر ملا اسلام پر اپنی اجارہ داری ثابت کرتا ہے اور اپنی سیاسی قیادت کو ضروری ٹھہراتا ہے۔ لیکن اس بلند بانگ اور مسحور کن دعوے کی صداقت ٹٹولنے کے لئے جب ہم قرآن پاک کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس میں چار اقسام کی آیات ملتی ہیں:۔

۱۔ بنیادی اصولوں سے متعلق واضح آیات۔

۲۔ تشبیہ کے طور پر آئی ہوئی علامتی آیات۔

۳۔ وقتی حالات کے مطابق دیئے ہوئے عارضی احکامات سے متعلق آیات۔

۴۔ فروعی مسائل سے متعلق آیات۔

مذکورہ اقسام کی آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا لب لباب یہ ہے۔

(۱) **بنیادی اصولوں سے متعلق واضح آیات** :۔ اس نوع کی آیات میں مندرجہ ذیل نکات اجاگر کئے گئے ہیں۔

(الف) ہر قوم اور ملک میں ہر زمانے میں خدا کی جانب سے پیغمبر اور مصلح مامور کئے جاتے رہے ہیں۔ جو وقت کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے آئے ہیں۔

ب۔ ان سب کے پیغامات میں بنیادی وحدت موجود رہی ہے۔

ج۔ اسلام دینِ فطرت یعنی قانونِ ارتقاء ہے۔

د۔ دنیا کی ہر شے، جسم و روح، عقیدۂ مذہب اور علم و معلومات سمیت، قانونِ ارتقاء کے مطابق روز بروز ترقی پذیر ہے۔

ہ۔ مذاہب اور ہدایات خداوندی کی بنیادی غایت مساوات اتحادِ انسانی۔ امنِ عالم اور ترقی بنی آدم ہے۔

و۔ ارتقاء کی ضد تنزل (کفر) ہے جو تعصب و نفاق سے پیدا ہوتا ہے۔

(۲) **تشبیہی یا علامتی آیات** :۔ وہ اس قسم کی ہیں جن میں :

الف ۔ قدیم اقوام اور پیغمبروں کے قصے بیان کیے گئے ہیں ۔
ب ۔ پیدائشِ آدم آسمانوں عرش وکرسی ۔ لوح وقلم اور اللہ کے چہرہ ۔ ہاتھ پاؤں وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے ۔
ج بہشت و دوزخ اور روزِ قیامت وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے ۔

اس قسم کی جملہ آیات کی نوعیت محض تشبیہی، تمثیلی یا علامتی ہے ۔ ان کے لفظی معنوں کو اختیار کرکے ان کے ظاہری مفاہیم پر اصرار کرنا صاحبِ عقل لوگوں کے سامنے اسلام کی عظمت کو گھٹانے کے مترادف ہوگا ۔ اس لیے کہ اس قسم کی روایتی باتیں عقل، تجربہ اور تاریخ کی روشنی میں غلط ثابت ہو چکی ہیں ۔

(۳) عارضی احکام سے متعلق آیات :۔ یہ اس قسم کی آیات ہیں جن میں وقتی اور ہنگامی حالات کے مطابق کچھ احکامات دیئے گئے تھے جو حالات تبدیل ہو جانے کی وجہ سے آج ساری دنیائے اسلام میں منسوخ تصوّر کیے جاتے ہیں مثلاً (تبلیغی مقاصد کے لیے) جہاد ۔ مالِ غنیمت کے طور پر مفتوحہ عورتوں اور مردوں کو غلام بنانے ۔ ان کا مال واسباب لوٹنے اور کفار کو جہاں ملیں قتل کرنے کے احکامات وغیرہ وغیرہ ۔

(۴) فروعی مسائل سے متعلق آیات : یہ اس نوع کی آیات ہیں جن میں اس دور کے معاشرہ کے روایتی تقاضوں کے مطابق کچھ سماجی اور اخلاقی سزائیں یا ہدایات بیان کی گئی ہیں ۔ جیسے کہ چور کے ہاتھ کاٹنا ۔ قتل کے قصاص میں قتل کرنا ۔ زنا کے جرم میں سنگسار کرنا ۔ جانوروں کی قربانی کرنا ۔ زکوٰۃ دینا ۔ سود کو ناجائز ٹھہرانا ۔ بعض اشیاء اور باتوں کو ممنوع اور بعض کو مباح قرار دینا اور اسی طرح 'اقتصادی' سیاسی اور معاشرتی مسائل سے متعلق دیگر مختلف ہدایات ۔

چونکہ اس قسم کے فروعی معاملات کی نوعیت اور اس کے تقاضے ہر دور کے تمدن کے مطابق مختلف ہوتے ہیں ۔ اس لیے معاشرہ کی تبدیلی کے ساتھ اس کی متعلقہ قدریں بھی بدل جاتی ہیں ۔ نہ ضابطے اپنی قدیم صورت میں باقی رہ جاتے ہیں ۔ نہ احکامات نہ قدیم نادیبیں ہی مناسب رہتی ہیں اور نہ ہی سابقہ ہدایات ۔

یہ قانونِ فطرت جملہ الہامی کتابوں کی بیان کردہ شریعتوں پر نافذ ہوتا ہے اس لیے کہ وہ اپنے اپنے دور کے تمدنی معاشرہ کے مطابق تھیں۔ لیکن رجعت پرست ملاّ یہ تو تسلیم کرتا ہے کہ تبدیلی معاشرہ کے سبب سے اس قسم کے مسائل پر دوسری الہامی کتابوں کے احکامات منسوخ ہو چکے ہیں پر اسی نوع کی قرآن میں بیان کردہ ہدایات کو وہ وقتی یا دور ِ حاضرہ کے بدلے ہوئے معاشرہ کے لیے ناموزوں ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ خود دنیائے اسلام میں آج سے نہیں صدیوں سے ان پر عمل متروک ہو چکا ہے۔ ملاّ اپنی ہٹ دھرمی سے صرف اس وجہ سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اس طرح اسے اپنے طبقاتی اقتدار کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اسی اندیشہ سے بچنے کے لیے وہ مسلمانوں کو دنیا بھر سے پسماندہ اور لاتعداد فرقوں میں بٹا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے تشریح کردہ اسلام میں موجودہ سائنسی دور کی تو کیا زراعتی تجارتی اور شہری تمدن کی ضرورت کے مطابق بھی رہنمائی موجود نہیں مگر دعویٰ چاند ستاروں کی زندگی کے مسائل کے حل کا رکھتا ہے۔

بلاشبہ دیگر مقدس مذہبی کتب کی طرح قرآن پاک سے بنیادی نوعیت کی باتوں کے ضمن میں استفادہ حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس سے انسانیت کے مقصد کو خاطر خواہ تقویت پہونچائی جا سکتی ہے۔ لیکن دوسری باتوں کے سلسلہ میں ہمیں اپنے دور کے تمدنی و معاشرتی تقاضوں اور عقل و تجربہ ہی کو اہمیت دینی پڑے گی۔ دینِ فطرت (قانونِ ارتقاء) کا یہی تقاضہ ہے۔

مفاد پرستوں کا چوتھا دعویٰ

اسلام کی اپنے رنگ میں تشریح کرنے والے اس بات پر بھی بیحد اصرار کرتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلعم دنیا کے آخری پیغمبر ہی نہیں بلکہ آخری مصلح اور رہنما بھی تسلیم کیے جانے چاہئیں اور ہر دور سے متعلق جملہ معاملات زندگی کے بارے میں ہدایات و تعلیمات کے

کے سلسلہ کو ان پر ختم سمجھنا چاہیے۔ اس مسئلہ پر بھی ملا اور صوفی کی توضیحات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ملا اس دعوے کی بنیاد پر مندرجہ ذیل کلیئے بناتا ہے:

۱۔ آنحضرت صلعم نے ایک نیا دین پیش کیا۔ جس کے بعد سابقہ ادیان منسوخ ہو گئے اور آئندہ کے لیے بھی یہ سلسلے بند ہو گئے۔

۲۔ یہ دین مسلمانوں کی شکل میں ایک نئی انسانی تفریق کو جنم دیتا ہے۔

۳۔ اسلام یا آنحضرت صلعم کی تعلیمات کا اصل نچوڑ وہ عبادتیں ریاضتیں۔ رسوم۔ عقاید اور سماجی و اخلاقی ضابطے ہیں۔ جو آپ نے جاری کیے، اور جو مسلمان اور غیر مسلمان میں امتیاز پیدا کرتے ہیں۔

۴۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف مسلمانوں کے ہادی اور پیشوا ہیں۔

۵۔ صرف مسلمان ہی ان کے پسندیدہ پیروکار ہو سکتے ہیں۔

۶۔ آنحضرت صلعم دنیا کو ابدی نظامِ حیات اور ابدی روحانی پیغام عطا کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

۷۔ آنحضرت صلعم خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ ہی دنیا کو کسی رہبر کی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ کی جاری کردہ شریعت قیامت تک دنیا کے کام آئے گی۔

ان باتوں کے بارے میں صوفی کے عقاید حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیادی اعتبار سے کوئی نیا دین ایجاد نہیں کیا۔ بلکہ دینِ فطرت (توازنِ ارتقاء) کی تاسیس کی ہے۔ یہی سابقہ پیغمبروں کے ادیان کا لبِ لباب تھا۔

۲۔ آنحضرت صلعم کا مشن نئی تفریقات کو جنم دینا نہیں بلکہ جملہ انسانی تعصبات کو مٹانا اور یکجہتی و بھائی چارہ کو فروغ دینا تھا۔

۳۔ آنحضرت کی عالمگیر انسانی تعلیمات کو چند ظاہری عقاید و رسوم اور رسمی ضابطوں میں محدود کرنا ان کے عظیم نصب العین کے یکسر خلاف ہے۔

۴۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف مسلمانوں کا پیشوا قرار دینا حقیقت کے خلاف ہے۔ وہ ساری اُمت کے ہادی رحمت اللعالمین اور شفیع المذنبین ہیں۔ انھیں دنیا کے باہم حریف رسمی مذاہب میں سے کسی ایک کا لیڈر ٹھہرانا ان کے اعلیٰ مرتبہ اور مقصد کے خلاف ہے۔

۵۔ دنیا کا ہر صالح انسان ان کے پیروؤں میں سے ہے اور ہر غیر صالح شخص ان کے پیروؤں کے دائرہ سے باہر ہے۔

۶۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دو مقاصد تھے۔ ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ ظاہری مقصد میں حکومتی نظام اور دنیاوی باتوں کی اصلاح شامل تھی۔ یہ مقصد آپ کی زندگی ہی میں پورا ہو چکا۔ اس کی نوعیت وقتی اور عارضی تھی۔ باطنی مقصد کا تعلق لوگوں کی صحیح تعلیم۔ درستگیٔ اخلاق اور اصلاحِ نفس سے تھا۔ جس کے بغیر اتحادِ انسانی۔ امن عالم اور ترقیٔ بنی آدم کا اعلیٰ نصب العین حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی نوعیت بلاشبہ دائمی ہے اور یہی آپ کی بعثت کا مقصدِ اعلیٰ تھا۔ صوفی نے آپ کے اسی باطنی مشن کو اپنا نصب العین ٹھہرایا ہے اور ظاہر پرستوں سے الگ مسلک اختیار کیا ہے۔ اپنے اسی زاویۂ نگاہ پر فخر کرتے ہوئے شاہ لطیف فرماتے ہیں۔

"جیئَن ڈ ٹو ھومون، آدیائی اُدھان نہ ڈٹو ھو"

"یعنی جس طور پر میں نے اسے دیکھا اور پایا ہے۔ سہیلیو! تم نے اس طور نہیں دیکھا ہے۔"

صوفی حقیقتِ محمدی کا صحیح عرفان رکھتا ہے۔ اس کی نگاہ میں آپ مدینۃ العلم، رحمت اللعالمین۔ شفیع المذنبین اور صاحبِ قاب قوسین ہیں۔

۷۔ صوفی خاتم النبیین کے یہ معنی تصور کرتا ہے کہ نوع انسانی کا ذہن ترقی کی اس منزل پر پہونچ چکا ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد اب خدا کو فوق العقل اور

الہامی باتیں انسان کو بتانے کی ضرورت نہیں رہی۔ آنحضرت صلعم کے بعد اب خالق و مخلوق کے درمیان حائل پردے اٹھ چکے ہیں اور خدا کی جانب سے آنحضرت صلعم کی معرفت اہل دنیا کو خدا کا آخری اور ابدی پیغام "عشق و محبت" مل چکا ہے جس کے بعد کسی دوسرے الہٰی پیغام کی ضرورت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔

چنانچہ اس عقیدہ کی روشنی میں شریعت ظاہری کے ضابطے اور احکامات صوفی کے نزدیک وقت کے ساتھ منسوخ ہو چکے ہیں۔ اور ان امور کے فیصلے جمہوری حکومتوں کے ہاتھ میں آچکے ہیں۔ صوفی اِن امور میں ملّا کے دخل کو ناجائز سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک مذہبی حکومتیں قائم کرنے کا نعرہ صرف ملّا، پنڈت اور پادری وغیرہ کے مستقل ذاتی مفاد قائم رکھنے کا ایک حیلہ ہے۔ دین بندہ اور خدا کے درمیان کا شخصی معاملہ ہے۔ دوسروں کا اس میں دخل دینا اور درمیان کی کڑی بننے کی کوشش کرنا عقیدہ ختم نبوت کا مذاق اڑانا ہے۔ صوفی اسلام کو اتحاد، امن اور ترقی کا عالمگیر پیغام تصوّر کرتا ہے۔ وہ مذہبی نظاموں کی چہار دیواریوں اور تفریقوں میں الجھ کر اصل مقصد کو نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا۔

مفاد پرستوں کا پانچواں نعرہ

اسلام کی اپنے مخصوص رنگ میں تشریح کرنے والوں کا پانچواں اہم نعرہ یہ رہا ہے کہ مسلمان خدا کے نزدیک پسندیدہ اور افضل ترین قوم ہیں۔ چنانچہ دنیا کی جملہ اقوام کی قیادت اور رہنمائی کرنا انکا حق اور فرض ہے۔ اس نعرہ کا اصل مقصد سادہ لوح مسلم عوام کو برتری کے نشہ میں مست کر کے مفاد پرستوں کی طاقت اور دولت میں اضافہ کی خاطر قربانی کا بکرا بنانا اور کمزور اقوام و ممالک پر قبضہ جمانا رہا ہے۔ صوفیائے کرام اس بات کو صحیح اسلامی تعلیم کے خلاف سمجھتے رہے ہیں۔

وہ جانتے تھے کہ ظاہری اسلام کے نام پر "برگزیدہ مسلم قوم" قرار دیئے جانے والے بیشتر لوگ کبھی بھی خدا کے پسندیدہ خیال و عمل پر متفق نہیں رہے ہیں۔ ان میں لاتعداد فرقے پیدا ہوگئے تھے جو سب ایک دوسرے کو کافر اور گمراہ ٹھہراتے ہوئے ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہاتے رہے ہیں۔ دوسروں سے قطع نظر انھوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی نواسہ امام حسین علیہ السلام تک کو مع عزیزوں دوستوں کے بیدردی کے ساتھ قتل کیا۔ ان کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے اور ان کے سروں کو نیزوں پر چڑھا کر ہفتوں گاؤں گاؤں شہر شہر ان کی نمائش کرتے رہے۔ صدہا اصحاب تابعین۔ تبع تابعین۔ بزرگانِ دین۔ اولیائے کرام اور حق پرست مسلمانوں کو اختلافِ رائے کے سبب طرح طرح کی وحشیانہ اذیتیں دے کر ہلاک کیا گیا۔ بعد کے دور میں منصور۔ سرمد۔ شمس تبریز۔ شاہ بلال اور شاہ عنایت صوفی وغیرہم بھی پہلے حق پرستوں کی طرح مسلمانوں کے ہاتھوں ہی شہید کئے گئے۔

برسرِ اقتدار طبقہ جب بھی کسی مومن کو اپنے راستے سے ہٹانے کا تہیہ کرتا تھا اس کے نمک خوار مُلّا کا فتویٰ اور سپہ سالار کی تلوار ہمیشہ دونوں مل کر اس کی مدد کرتے تھے۔ مسلمانوں کی ساری تاریخ ایسے واقعات سے بھرپور ہے۔ جو شخص بھی فرضی اور نشہ آور نعرے لگا کر اور فکر و عمل کی وحدت کو ان کی بنیادی خصوصیت قرار دے کر مسلمانوں کو دنیا کی ایک الگ برتر اور دوسروں پر قیادت کرنے کی مجاز قوم ٹھہراتا ہے۔ یا تو وہ مسلمانوں کی تاریخ سے ناواقف ہے یا پھر جان بوجھ کر اپنے مفاد کی خاطر سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دینا اور قربانی کا بکرا بنانا چاہتا ہے۔ وقتی طور پر کسی خاص گروہ میں ایسے شخص کو خواہ کیسے ہی عمدہ خطابات سے یاد کیا جائے لیکن مسلم عوام کا شعور دن بدن ترقی پذیر رہے ہے۔ وہ دن زیادہ دور نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جب وہ ایسے لوگوں کو ان کے اصل کردار کے مطابق خطابات سے نوازیں گے۔

صوفیانہ مسلک سے قطع نظر اگر مفاد پرستوں کے اس دعوے کی عقل اور تجربہ کی کسوٹی پر بھی جانچ کی جائے تو وہ غلط ہی ثابت ہوگا۔ گزشتہ دنوں ۱۹۵۳ء میں پنجاب

میں ہونے والے فسادات کے سلسلہ میں تحقیقات کرنے کے لیے حکومتِ پاکستان نے ہائی کورٹ کے دو ججوں جسٹس محمد منیر اور جسٹس رستم کیانی ۔ پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تھا کمیشن کے ان مقتدر اراکین نے اپنی رپورٹ میں تحریر کیا کہ جب پاکستان کے جید علمائے اسلام ان کے پاس شہادت دینے کے سلسلہ میں آئے تو سوالات پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظریۂ حیات کے بارے میں ان سب کی کوئی ایک رائے نہ تھی۔ ہر ایک نے ایک دوسرے سے مختلف خیالات ظاہر کیے۔ ہر فرقہ کے عالم نے دوسرے فرقہ کے پیروؤں کو گمراہ اور کافر قرار دیا۔ ان ججوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ اگر ان علمائے کرام کی شہادتوں پر اعتماد کر لیا جائے تو ایک بھی مسلمان راہِ راست پر نظر نہ آئے گا۔

یہ حال تو ان فرضی مسلمانوں کے عقیدہ کا ہے لیکن اگر آپ ان کے اعمال پر نگاہ ڈالیں گے تو اس مثالی قوم میں آپ کو نہ جانے کتنے لوگ راشی - زانی - چور - بدکار، ظالم، منافق اور غریبوں کا خون چوسنے والے اور ایک دوسرے کے جانی دشمن نظر آئیں گے اور قدیم کہاوت "مسلمانی در کتاب، مسلماناں در گور" کا نقشہ سامنے آئے گا۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے انھیں وحدت خیال و عمل پر بنیاد رکھنے والی مثالی قوم کس طرح کہا جاسکتا ہے۔ ایسی کوئی قوم نہ ماضی میں رہی ہے۔ نہ حال میں ہے اور نہ ہی مستقبل میں وجود میں آسکتی ہے۔ یہ نعرہ اقتدار پسند گروہ کی جانب سے اپنے طبقاتی مفاد کی خاطر صرف عوام کو گمراہ کرنے کے لئے ایجاد کیا گیا ہے۔ جس کی عملاً کوئی حقیقت نہیں۔ اور آج کل تو یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ کتنے ہی غیر مسلم ممالک کے مقابلہ میں مسلم ممالک ہر لحاظ سے بے حد پسیت ہیں، مسلمانوں کو دنیا کی افضل ترین قوم ٹھہرانا اور دنیا کی رہبری اور قیادت کا دم بھرنا خود فریبی۔ دھوکہ، جہالت اور ہٹ دھرمی کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟

اسی قومی تصور کو بنیاد بنا کر برصغیر میں پاکستان کی تحریک چلائی گئی تھی۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں سندھ مسلم لیگ کی طرف سے ایک اشتہار تقسیم کیا گیا تھا جس میں یہ باتیں درج تھیں۔

پاکستان اس غرض کی وجہ سے قائم کیا جاتا ہے کہ:

۱۔ اس میں حکومتِ الٰہی قائم کی جائے گی۔

۲- جس میں ملک کے تمام باشندوں کو سیاسی۔ اقتصادی اور معاشرتی مساوات حاصل ہو گی۔

۳- جس میں حکومت کی باگ ڈور صالح اور ایماندار لوگوں کے ہاتھوں میں ہو گی۔

۴- جس میں ہر مذہب اور فرقہ کے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔

۵- اس کی حکومت کا فرض ہو گا کہ ملک سے غربت۔ ظلم۔ جہالت اور سرمایہ داری کو ختم کرے۔

۶- یہاں عدل وانصاف کی سہولتیں لوگوں کو مفت فراہم کی جائیں گی۔

۷- یہاں عزت کا معیار طاقت اور دولت کو نہیں بلکہ اخلاق حمیدہ کو قرار دیا جائیگا۔

اب ذرا جائزہ لیجئے کہ پاکستان بننے کے بعد ان میں سے کن کن باتوں کے وعدے پورے کیے گئے ہیں۔ پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ جن برائیوں کو دور کرنے کا یقین دلایا گیا تھا وہ ختم تو نہیں ہوئیں ہاں ان میں بے پناہ اضافہ ضرور ہو گیا ہے۔ پاکستان صرف حکمران گروہوں کی چراگاہ بن کر رہ گیا ہے۔ اور عوام کی حالت روز بروز خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔ بلکہ اس مملکت کو وجود میں لانے کی ہمہ گیر جذباتی تحریک کے سبب:

- کروڑہا ہندو اور مسلمان اپنے آبائی وطن اور گھر بار چھوڑ کر آج تک دربدر ہیں۔ اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔
- لاکھوں افراد وحشیانہ طور پر قتل کیے گئے۔ ہزاروں عورتیں اغوا کی گئیں اور اربوں روپے کی ملکیت تباہ و برباد ہوئی۔
- نفرت اور تشدد کے جذبات دونوں ملکوں کے لوگوں پر اس بری طرح حاوی ہو گئے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف مختلف شکلوں میں برسرپیکار رہتے ہیں، اپنی آمدنی ملک کی حالت سدھارنے کے بجائے اسلحہ پر خرچ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے بڑی طاقتوں کی انگلیوں پر ناچتے ہیں۔

٥ جذباتیت کی اسی کیفیت کی وجہ سے دونوں ملکوں کے بیشتر لوگ رواداری، برداشت اور انسانیت کے احترام سے اتنے بے بہرہ ہو گئے کہ خود آپس میں بھی محض اختلاف رائے کی وجہ سے وہ دوسرے کو نفرت و تشدد کا نشانہ بنانے کے لیے ادھار کھائے بیٹھے رہتے ہیں۔

اگر ان ساری خرابیوں کے باوجود دونوں ملکوں میں امن قائم رہتا اور عوام کی بھلائی پر توجہ دی جاتی تو کہا جا سکتا تھا کہ نقصانات کی تلافی ہو گئی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بات بگڑتی ہی جا رہی ہے۔

جب ہم ان ساری برائیوں کی اصل جڑ تلاش کرتے ہیں تو وہ ہمیں سوائے انتہا پسندانہ جذباتیت کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتی اور ہمارے یہاں اس انتہا پسندانہ جذباتیت کو جو بات بھڑکاتی چلی آئی ہے وہ اسلام کی مفاد پرستوں والی تشریح اور اس کے نعرے ہیں۔ انہی نعروں کی وجہ سے سادہ لوح مسلمان عوام اپنے اور بنی نوع انسان کے بنیادی مشترکہ مسائل سے توجہ ہٹا کر مفاد پرستوں کے اقتدار کی خاطر دوسروں سے یا آپس میں الجھ پڑتے ہیں۔ اور یوں اسلام جو دنیا میں محبت اور امن کا پیغام لے کر آیا تھا نفرت و اشتعال اور بدامنی و انتشار کا سبب بنا دیا جاتا ہے۔

پاکستان میں اس خطرناک نظریہ نے جو حالات پیدا کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ سیاسی معاملات میں مذہبی تفریق کی وجہ سے ملک کی غیر مسلم اقلیتوں میں اپنے مستقبل کے بارے میں بددلی اور مایوسی پھیل رہی ہے۔

۲۔ خود مسلم اقلیتی فرقے، غیر توہم پرست اور آزاد خیال مسلمان اور صوفیانہ مسلک کے پیرو بھی ملک کی ترقی پذیر مذہبی جنون کی فضا سے خوف محسوس کرنے لگے ہیں۔

۳۔ ملا ازم اور اس کی بڑھتی ہوئی مذہبی دہشت گردی نے ملک میں بے لاگ

علمی تحقیق و تفتیش ۔ ادبی و سائنسی کارناموں اور ایجادی صلاحیتوں کے ابھرنے کے امکان کو خطرہ میں ڈال دیا ہے ۔

۵۔ ایک خاص طبقہ کے مفاد کی خاطر وحدت کے نام پر چھوٹے صوبوں کا وجود ختم کر دیا گیا ہے اور ان صوبوں کے قدیم باشندوں کے سیاسی ۔ سماجی اور ثقافتی حقوق کا ون یونٹ نظام کے تحت کھلم کھلا استحصال کیا جا رہا ہے ۔[1]

۶۔ مشرقی پاکستان کے لوگ اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی اپنے منصفانہ حقوق سے محروم ہیں ۔

۷۔ ہندوستان سے کشمیر کے مسئلہ پر اور افغانستان سے پختونستان کے مسئلہ پر بائیس برس گزر جانے کے بعد بھی آج تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا ہے ۔ جس کی وجہ سے ملکی پیداوار کا بیشتر حصہ ہمیں دفاع پر خرچ کرنا پڑتا ہے ۔ اور قرض کے لیے بڑی طاقتوں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے ۔

۸۔ ہنگامی نعروں کو سیاسی مسائل کا روپ دے کر اقتدار پسند طبقہ عوام کو جمہوری حقوق اور معاشی انصاف سے محروم رکھتا آیا ہے ۔

۹۔ عوام کے بیدار ہوتے ہوئے سیاسی شعور کو پھر سے گہری نیند سلا دینے کے لیے ملکی کاروبار کو مذہبی بنیادوں پر چلانے کا زور شور سے راگ الاپا جا رہا ہے ۔ حالانکہ وراثت اور نکاح کے قوانین کے علاوہ روایتی اسلام کا موجودہ دور کی حکومتوں کے ضابطوں سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ملا کا تشریح کردہ اسلام موجودہ بشری اور سائنسی تمدن کی رہنمائی کر سکتا ہے ۔

۱۰۔ ملا کے تشریح کردہ اسلام سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ملک کا نوجوان طبقہ مذہب سے دل برداشتہ ہوتا جا رہا ہے اور اسلام کو طبقاتی استحصال اور ظلم کا حامی محسوس کرنے لگا ۔

اسلام کو کسی ایک خاص گروہ اور علاقہ کے دائرہ میں محدود کرنے کی فکر کو غلط قرار دیتے ہوئے علامہ آئی ۔ آئی قاضی فرماتے ہیں :" صحیح مسلمان اپنی بلند

---

[1] :- یہ کتاب ون یونٹ کے دور میں لکھی گئی تھی ۔

خیالی اور صفاتِ عالی کی وجہ سے ہر ماحول کو اپنا لیتا ہے۔ ماضی میں اسی طرح کے چند آدمیوں نے (فوج اور اسلحہ کے بغیر) دنیا میں پھیل کر اسلامی تعلیم کو فروغ دیا۔ آج اس دینِ فطرت کے پیروکاروں کو کمزور جان کر "شفاخانہ" (مخصوص علاقہ) میں داخل یا محدود کرنے کی تجویز صحیح اسلامی تعلیم سے ناواقفیت اور مسلمان کہلانے والوں کی بے ہمتی کا ثبوت ہے۔"

مشہور اسلامی مفکر اور خاکسار تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ خان مشرقی اپنی مشہور کتاب "تذکرہ" میں اس سلسلہ میں اور زیادہ واضح لفظوں میں تحریر فرماتے ہیں: "لوگوں کی موجودہ گروہ بندی مصنوعی اور غیر حقیقی ہے۔ ہر صالح آدمی چاہے ظاہری طور پر وہ کسی بھی مذہبی گروہ میں شامل ہو، مسلمان ہے اور اسی طرح ہر غیر صالح آدمی غیر مسلم ہے۔"

مفاد پرستوں کی اسلامی تشریح کا چھٹا اہم نعرہ

اسلام کو اپنے مخصوص مفادات کے حصول کا ذریعہ بنانے والوں کا چھٹا اہم نعرہ یہ ہے کہ "اسلام [illegible] نوعِ انسان کی نجات اور رہبری کا واحد ذریعہ ہے اس لیے اسے فروغ دینے کے [illegible] لازمی ہے۔" اگر مُلّا ازم کے [illegible] کو [illegible] دے گا تو یہ معلوم ہونے میں دیر نہ لگے گی کہ یہ بھی ایک ایسا کھوکھلا اور جاہلانہ روایتی شعبدہ ہے جس کے ذریعہ مفاد پرست عناصر اپنی اغراض کے لیے سادہ لوح مسلمان عوام کو قربانی کا بکرا بناتے ہیں۔ میں سطور بالا میں یہ بیان کر آیا ہوں کہ آنحضرت صلعم کے بعد اسلام کا کبھی ایک متفقہ یا واحد تصور نہ موجود رہا ہے نہ آئندہ ایسا ہونے کا امکان ہے۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کس قسم کے اسلام سے دنیا کو مشکلات سے نجات دلائی جانی ہے کہ جہاد کر کے لوگوں سے اس کو زبردستی منوایا جائے۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے مُلّاازم کے اسی نوع کے خیالات سے متاثر ہو کر فرمایا ہے ۔ "ہندوستان میں بعض مسلمان اپنی قومیت کے بارے میں ایسے وہمی تصور میں مبتلا ہیں جس کا عملی دنیا میں کوئی وجود نہیں ۔ ہم مدت سے اسلامی جماعت کا نام لیتے آئے ہیں ۔ لیکن اس کے متعلق نہ ہمارے ذہنوں میں کوئی واضح نقشہ ہے اور نہ ہی دنیا میں اس قسم کی جماعت کا کہیں وجود ہے ۔ ہم نے اپنے آپ کو ایک ایسی خیالی دنیا میں محدود کر رکھا ہے کہ ہم نہ صرف دنیا کے دیگر مسلمان ملکوں کی تاریخ ترقی اور آزادی کی جدوجہد سے ناواقف ہو کر رہ گئے ہیں بلکہ خود اپنے ملک میں بھی ہمارے سامنے کوئی واضح طور پر طے شدہ عملی نظریہ موجود نہیں ہے ۔"

اس دور میں اُن مسلمانوں کے بارے میں جو علمی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی طور پر دنیا کی بیشتر اقوام کے مقابلہ میں انتہائی پست ہیں، یہ دعویٰ کرنا کتنی کھلی ہوئی خود فریبی ہے کہ وہ دنیا کی مہذب، متمدن، ترقی یافتہ اور طاقتور اقوام کی قیادت اور رہبری کے اہل ہیں ۔ ملاازم میں رکھا ہی کیا ہے جس سے وہ رہبری حاصل کریں گے ۔ کس کا دماغ خراب ہوا ہے جو خود محتاج، بدحال، جاہل اور توہم پرست سوسائٹی کی قیادت کے تحت آنا قبول کرے گا ۔ اور جب دیگر اقوام خوشی سے ملاازم کے زیر اثر آنا گوارا نہ کریں تو اسلام کے بزعم خود اجارہ داروں کے پاس وہ کون سی طاقت ہے جس کے ذریعہ وہ جبراً انھیں اپنی قیادت تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں ؟

فی الواقع اسلام کی عظمت اور تقدس کا تقاضہ اس دور میں یہ ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے مُلّاازم کا خاتمہ ہونا چاہیئے ۔ یہ بات واضح ہے کہ چاہے ملاازم کی حمایت میں علامہ اقبال کا فلسفہ پیش کیا جائے یا مولانا مودودی کا نفرت، تنگ نظری، تشدد اور فسطائیت کے جن نظریات کو آج کے متمدن دور میں رائج کرنے کی خواہش کی جا رہی ہے، سب قدیم دور وحشت و جہالت کی لعنتیں ہیں ۔ ان سے نجات حاصل کئے بغیر مسلمانوں کی فلاح ناممکن ہے ۔

ویسے بھی جہاد یا طاقت کے ذریعہ دنیا میں ملاّ ازم پھیلانے کا خیال اس دور میں ایسا ہی ہے جیسے چوہا شیر کے شکار کا دعویٰ کرے۔ حالانکہ خود وہ مغربی ممالک بھی جو ہر اعتبار سے ساری دنیا کے ممالک پر برتری رکھتے ہیں۔ طاقت کے زور پر کمزوروں سے اپنے نظریات منوانے کے خیال سے دستبردار ہو چکے ہیں اور کم از کم ظاہری طور پر ہی بقائے باہمی Co-existence کے اصول پر اتفاق کرنے لگے ہیں۔ روسی کمیونسٹ، جن کا بنیادی عقیدہ ہی تشدد کے ذریعہ دنیا میں اشتراکی انقلاب برپا کرنا رہا ہے، اپنے اس عقیدہ کو ترک کر کے باہمی تعاون یا علمی تہذیبی اور اقتصادی مقابلہ کے اصول پر قانع ہو گئے ہیں۔ آج دنیا میں صرف کمیونسٹ چین۔ پاکستان اور اسرائیل ہی ایسے ممالک رہ گئے ہیں، جہاں کے چند گروہ طاقت کے ذریعہ اپنے عقیدہ کو ترقی دینے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ایٹمی عہد میں وہ ساری دنیا کو کسی طرح بھی محکوم نہیں بنا سکتے۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے ان نشہ آور نعروں کے ذریعہ اپنے ملک میں مخالف رائے رکھنے والوں کو دبا کر کچھ عرصہ وہ اپنا گروہی تسلط قائم رکھیں۔

ملاّ ازم کا ساتواں نعرہ

"دین اور سیاست ایک ہیں" یہ ملاّ ازم کا ساتواں اہم نعرہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی جو حکومت ہو اس کی باگ ڈور خلیفۂ اسلام، امیر جماعت یا کسی آمر شخص یا گروہ کے ہاتھ میں رہے۔ اس قسم کی حکومت کا کاروبار قرآن و سنت کے نام پر برسر اقتدار گروہ کے نمک خوار مفتیوں کی تشریحات کے مطابق چلایا جائے گا۔ تاریخ شاہد ہے

ہیں۔ کہ اس نوع کی حکومتیں عوام کے لئے کس قدر مصیبت کا باعث ثابت ہوئی ہیں۔ اور ان میں کس طرح عقل علم۔ دلائل انصاف اور عوامی حقوق کا صفایا کر دیا جاتا ہے۔ موجودہ دور کی اصطلاح میں اس قسم کی جابر حکومت "فاشی طرز حکومت" کہلائیگی۔

اہل اسلام میں قرآن وسنت کی صدہا تعبیریں رائج ہیں اور مسلمان کتنے ہی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں کس فرقہ کی تشریح صحیح اور کس کی غلط ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا اور یہ فیصلہ ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ ؟ مستزاد کہ ذاتی مفاد کے تحت ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے قسم کے لوگ وقتی طور پر جا ہے جو کچھ بھی کہیں لیکن جب تیرہ سو پچاس برسوں میں اس بات کا متفقہ فیصلہ نہ ہو سکا تو اب نہ کون سے ٹھوس اسباب اور امکان پیدا ہو گئے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے حق یا ناحق ہونے کا مسلمہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

بنیادی باتوں کو چھوڑیئے جزیاتی باتوں میں بھی ان سب میں دیرپا اتفاق قائم رہنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر حکومت کی جانب سے نافذ کئے جانے والے عائلی قوانین کی ہی بات کو لیجئے۔ ایک گروہ بڑی شد و مد سے اس کو خلاف اسلام قرار دیتا ہے جبکہ دوسرا گروہ اسی شدت سے انھیں عین اسلامی ٹھہراتا ہے اور پھر دونوں ہی اسلامی حکومت کا راگ الاپتے ہیں۔

اسلام کے نام پر گمراہ ہونے والے لوگ اگر اوراق تاریخ پر نگاہ ڈالیں گے تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ مذہب اور ریاست کو ساتھ چلانے سے ملکوں، قوموں اور عامتہ الناس کو کتنے ہولناک مصائب برداشت کرنے پڑے ہیں۔ یہ تاریخ کے انہی تجربات کا نتیجہ ہے کہ آخر کار ہندوؤں۔ عیسائیوں اور بیشتر ممالک کے مسلمانوں نے اس روش سے کنارہ کشی اختیار کی ہے۔ سیاست اور مذہب کو ساتھ رکھنے کے طرفداران تجربات کی روشنی میں اسلام کے نادان دوست ہی نہیں بلکہ کھلے ہوئے دشمن ہیں اپنی غرض اور ہٹ دھرمی کی خاطر وہ عوام الناس کو اسلام سے بدظن اور مایوس کر دینا چاہتے ہیں۔ روس یا بعض دیگر ممالک میں دہریت کے

فروغ یا مذہب بیزاری کا سبب یہی مذہب کی جا و بے جا گرفت اور تنگ نظری ہے ۔ اسلامی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مفاد پرست ملاؤں نے ہمیشہ حکمرانوں کی مرضی کے مطابق اسلام کی تشریحات کی ہیں اور حکمرانوں کے جبر کا نشانہ بننے والوں میں اسلام کی عظمت اور وقار کو گرانے کی کوشش کی ہے ۔

ملاازم یا دیگر مذاہب کی اسی طرح کی تعلیمات میں کوئی بھی ایسی بات موجود نہیں جو عہدِ حاضر کی تمدنی زندگی کے لئے رہنما یا مفید ثابت ہو سکے ۔ پھر مذاہب انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں نہ کہ انسان مذاہب کے لئے ۔ جب حالاتِ زندگی بدل جانے کی وجہ سے مذہبی شریعتیں اپنی افادیت ختم کر بیٹھتی ہیں تو محض روایتی اہمیت کی بناء پر ان سے معاشرہ کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے ؟

میں سمجھتا ہوں کہ یہ حقیقت لوگوں کے ذہن نشین ہو جانی چاہئے کہ ملاازم ایک مخصوص مفادی گروہ کی سنگین آمریت قائم کرنے کا ایک خطرناک ذریعہ ہے ۔ مفاد پرست طبقہ اسلام کے نعرہ کو صرف آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہا ہے ۔ اس معاملہ کو اس کے اصل رنگ میں دیکھنا وقت کا اہم تقاضہ ہے ۔ مسلمان عوام کو اس بات پر ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ کیا وجہ ہے کہ بیشتر مسلمان ممالک ملاازم کو اپنے یہاں سے ختم کر چکے ہیں ۔ اور کیا وجہ ہے کہ صرف پاکستان ہی وہ اسلامی ملک رہ گیا ہے جہاں شریعتی راج کا زور و شور سے راگ الاپا جا رہا ہے ؟؟

ملاازم کے یہ عملی و فکری تضادات خاص طور سے غور طلب ہیں کہ ایک جانب مبلغین "اسلام کے کٹر سیاسی نظام" کا نعرہ بلند کرتے ہیں مگر دوسری جانب وہ یونانی کافروں کی ایجاد کردہ "جمہوریت" اور برطانوی عیسائیوں کے تشکیل کردہ "پارلیمانی جمہوری نظام" کے حق میں بھی شور مچاتے ہیں ۔ ایک طرف وہ کاروبارِ مملکت میں عمل دخل رکھنے والوں کے لئے "عالمِ دین" ہونے کی شرطیں لگاتے ہیں ۔ اور دوسری طرف بالغ رائے دہی کے اصول پر بلا شرط عقیدہ ہر شخص کو دستور و حکومت سازی کا اہل تسلیم کرتے ہیں ۔ عورتوں کی آزادی اور تعلیم و

اسلام کے خلاف قرار دینے کے باوجود ایک طرف وہ انھیں مردوں کے مساوی ووٹ کا حق دیتے ہیں مگر دوسری طرف یہ ووٹ انھیں اپنے شوہروں اور سرپرستوں کی مرضی کے خلاف استعمال کرنے سے منع کرتے ہیں۔ ایک جانب وہ اسلامی اخلاق کا قصیدہ پڑھتے ہیں۔ اور دوسری جانب اپنے سیاسی مخالفوں کے خلاف ہر قسم کے اوچھے ہتھکنڈوں اور اشتعال انگیزیوں کو روا رکھتے ہیں۔ وہ تصویر سازی کو حرام قرار دیتے ہیں مگر خود لڑ لڑ کر اخباروں میں اپنی تصویریں چھپواتے ہیں۔ فلم اور رقص و موسیقی کو ناجائز ٹھہراتے ہیں۔ مگر ریڈیو اور ٹیلیویژن گھر پر رکھ کر ان سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے نام سے تو چڑتے ہیں مگر ذاتی لباس کے علاوہ مغربی تہذیب کی ایجاد کردہ ہر سہولت اور آسائش سے دل کھول کر استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے بہت سے صابن۔ تولیہ۔ فلش سسٹم۔ بجلی۔ گھڑی۔ ٹیلیفون۔ کار ٹی سیٹ۔ ڈنر سیٹ۔ صوفوں اور میز کرسیوں وغیرہ وغیرہ کو مغربی تہذیب سے خارج سمجھتے ہوں یا میلاد۔ مجلس اور نکاح خوانی وغیرہ کی فیس مقرر کرنے کو خالص اسلامی تہذیب قرار دیتے ہوں۔

یہ بات وہ خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ معاشرہ جس حد تک تبدیل ہو چکا ہے اس میں نہ دوسری روایتی باتوں کی طرح چور کے ہاتھ کٹوانے۔ زانی کو سنگسار کرنے۔ مذہبی اختلافات کرنے والوں کو قتل کرنے۔ جبراً داڑھیاں رکھوانے اور نمازیں پڑھوانے اور عورتوں کو پردہ کرانے وغیرہ وغیرہ کے قوانین نہ بنا سکیں گے اور نہ ہی ان پر عمل کرا سکیں گے لیکن اس کے باوجود وہ شرعی قوانین کے نفاذ کی رٹ لگائے جاتے ہیں۔

مُلّازم کے مبلغین کے فکر و عمل کے یہ سارے تضادات اس حقیقت کے علاوہ اور کس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ان کے سارے نعروں کا مقصد محض سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دینا اور ان کے جذبات کو ابھار کر انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا ہے۔؟

تاریخ گواہ ہے کہ مذہبی اقتدار کی وجہ سے ہی برہمنوں نے کروڑوں افراد کو اچھوت بنا کر رکھ دیا۔ اسی طرح عیسائی پادریوں نے بھی مذہب کے نام پر لاکھوں افراد کو آگ میں جلایا اور لاکھوں کو صلیبی جنگوں میں تباہ کر دیا۔ خود مسلمانوں کی تاریخ بھی ایسی لرزہ خیز مثالوں سے خالی نہیں۔ اسلام اور اجماعِ امت کے نام پر خلافت قائم کی گئی اور خلافت بادشاہت میں تبدیل کر دی گئی۔ حاکم سے اختلاف مذہب سے اختلاف ٹھہرائیوں فرقے پر فرقے وجود میں آتے رہے اور ان کے درمیان صدیوں شرمناک خونریزی اور غارتگری ہوتی رہی۔ انسانیت اور رواداری کا جذبہ ختم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ عہدِ قدیم کی وحشت اور بربریت کا دور دورہ ہو گیا۔ قابو میں آ جانے والے زندہ حریفوں کی کھال کھنچوانا۔ دیواروں میں چن دینا۔ ایک ایک اعضا کاٹ کر ہلاک کرنا۔ مر جانے والوں کی لاشوں کو گھوڑوں سے پامال کرنا۔ ان کی کھالوں میں بھوسہ بھروانا۔ ان کے سروں کو نیزوں پر چڑھا کر جگہ جگہ پھرانا اور پھر ان کی عورتوں اور بچوں کی تشہیر کرنا انھیں اذیتیں دینا اور جانوروں کی طرح فروخت کر دینا وغیرہ وغیرہ یہ سب وہ گھناؤنی حرکات ہیں جن کے بیشتر خلفاء یا بادشاہانِ اسلام فخر کے ساتھ مرتکب ہوتے رہے ہیں۔

حضرت عثمان کی شہادت۔ امیر معاویہ کی حضرت علیؓ سے جنگیں۔ امام حسینؓ کی شہادت کا المیہ۔ حجاج بن یوسف کے ہاتھوں جنگ کے علاوہ ایک لاکھ بیس ہزار برگزیدہ مسلمانوں کا قتل۔ ابو سفاح عباسی کے ہاتھوں بنو امیہ ان کے ہمدردوں اور ان کے بزرگوں کی قبروں اور ہڈیوں تک کا صفایا۔ عباسیوں اور فاطمیوں کے مابین ہونے والی خونریزیاں۔ بغداد اور بلادِ اسلامیہ کی مغلوں کے ہاتھوں بربادی اور تباہ کاری اور آخر میں اورنگ زیب کے بعد ہندوستان پر مغلوں کے اقتدار کا خاتمہ اور مرہٹوں کی تباہ کاریاں وغیرہ وغیرہ یہ سب ان ہولناک واقعات میں سے محض چند ہیں جو صرف مذہب کے نام پر خود مسلمانوں کے اندر بعض فرقوں کی انتہاپسندی کے عمل یا ردعمل کی وجہ سے ظہور میں آئے ہیں اور یہ مقولہ مشہور ہوا کہ "اسلام اپنے خون میں آپ نہایا"۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ ملاازم کی حیرتناک شعبدہ بازی ہے۔ کہ وحشی قاتل،
لٹیرے اور سفاک لوگ تو امیرالمومنین۔ نمازی اور ظل اللہ وغیرہ کے مقدس خطابات
کے مستحق ٹھہرے اور محبت و انسانیت کے مبلغ اور حق پرست بزرگ مرتد اور قاتل گردن
زدنی قرار پائے۔ منصور کو سولی پر چڑھا دیا گیا، شمس تبریز کی جیتے جی کھال اتروائی
گئی۔ سرمد کو قتل کیا گیا۔ شاہ عنایت کو شہید کیا گیا اور شاہ بلاول کو کولہو میں پلوا
دیا گیا۔

ہمارا مفاد پرست اقتدار پسند طبقہ بیرونی دنیا کے دکھاوے کی خاطر تو اختلافی
مسائل کو گفت و شنید کے ذریعہ پرامن طور پر طے کرنے کے اصول کی حمایت کرتا
ہے۔ اور خود کو آزادی و انصاف کے حقوق کا پرستار ظاہر کرتا ہے لیکن بنگال، سندھ
بلوچستان اور پختونوں کے جائز علاقائی حقوق سلب کرنے کے لیے ان میں سے
کسی اصول کو خاطر میں نہیں لاتا۔ دراصل ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے
کے اور ہوتے ہیں۔ آمرانہ طرزِ حکومت قائم کرنا۔ اختلافِ رائے کو طاقت کے ذریعہ دبانا۔
عوام الناس کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھنا یہ سب باتیں مذاہب اور سیاست کی آمیزش کی پیداوار ہیں۔

موجودہ دور میں جبکہ جملہ مذاہب خدا، انفرادی آزادی اور حیات بعد الممات
کے عقیدوں کو دہریت کی زد سے بچانے کے لیے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا
ہیں۔ دہریت عوام کے مفاد کے نام پر سائنس اور عقل کے حربوں سے کام لے کر
مذاہب کے جملہ بنیادی عقیدوں کی دیواریں مسمار کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ ان
حالات میں مذاہب سے محبت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ان کی پیروی کا دعویٰ کرنے
والے روایتی عقاید، تنگ نظری اور تعصب کو دین کی اساس قرار دینے کے
بجائے انسانیت کے احترام اور انفرادی و اجتماعی آزادی و ترقی کو دہریت کے
مقابلے میں زیادہ ارفع اور دلکش انداز میں پیش کرتے اور مل جل کر عملی
پروگرام کی بنیاد پر دہریت کے سیلاب کا مقابلہ کرتے۔ دیگر مذاہب کے مقابلہ
میں اسلام کو اور جملہ اہلِ اسلام کے مقابلہ میں ہمارے یہاں کے مسلمانوں کو اسی سلسلہ

میں سب سے آگے بڑھ کر کام کرنا چاہیئے تھا اس لیئے کہ اسلام کا جو شور و غلغلہ یہاں مچایا جاتا ہے اتنا دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں مچایا جاتا اور اسلام پر اجارہ داری کے جتنے دعویدار یہاں ہیں اتنے ساری دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں وقت کے اس اہم تقاضے کے بالکل برعکس عمل کیا جا رہا ہے۔ دہریت کو دشمن، بے شک بڑے زور شور سے قرار دیا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں ہر ممکن اشتعال انگیزی بھی کی جا رہی ہے لیکن نہ صرف یہ کہ دہریت کے مقابلہ میں اس سے زیادہ دلکش عملی پروگرام اور اخلاق اور عقلی دلائل پیش نہیں کیئے جا رہے ہیں بلکہ حملہ منفی انداز کی کارروائیوں سے یا تو سیاسی اختلاف رکھنے والوں کو دہشت زدہ کیا جا رہا ہے یا دہریت کی مقبولیت کے لیئے فضا سازگار کی جا رہی ہے۔ مذاہب کی عظمت قائم رہے یا ختم ہو جائے انھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہاں اپنے مفادات اور اقتدار کے بیشک دلوانے ہیں۔

بہرحال اگر ہمیں اپنے ملک عوام اور اسلام کی عظمت کو تباہی سے بچانا ہے۔ اعلیٰ اخلاق اور انسانیت کو ترقی دینا ہے۔ ظلم و تشدّد۔ نفرت و تعصب اور خود غرضی و مفاد پرستی کی لعنتوں سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہے تو ہمیں مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا پڑے گا۔ اور مُلّا ازم کے بجائے اسلام کی ایسی تشریح پر اعتماد کرنا ہو گا جو موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق مسائل کو حل کرنے میں معاون ہو۔

صوفیائے کرام کی اسلامی تعبیر کی وضاحت

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر "راسخون فی العلم متقین" اور

"اولوالالباب" کا ذکر آیا ہے۔ اور انھیں خدا، قرآنی آیات اور اسلام کا صحیح عارف بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات پیش کرتا ہوں:

(۱) ھوالذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمٰت ھن ام الکتاب واخر متشٰبھٰت فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والرٰسخون فی العلم یقولون آمنا بہ۔ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولی الالباب"

"یعنی اللہ نے آپ پر (آنحضرت صلعم پر) جو کتاب نازل کی ہے اس کی وہ آیات محکم ہیں جو بنیادی ہیں اور دیگر آیات تشبیہی ہیں۔ پھر وہ لوگ جن کے دل گمراہ ہیں تشبیہی آیات کی پیروی کرتے ہیں ان سے اپنی خواہش کے مطابق معنی نکال لیتے ہیں اور فتنہ پیدا کرتے ہیں۔ وہ ان کے صحیح معنی نہیں جانتے پر تاویل کرتے ہیں۔ صحیح معنی یا اللہ جانتا ہے یا وہ لوگ جو علم راسخ رکھتے ہیں۔ اور جو کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو علم ملا ہے اسی کے ذریعہ ہم ایمان لائے ہیں۔ یہ بات وہی کہتے ہیں جو صاحب غور و فکر ہیں"۔

۲۔ "ذالک الکتاب ھدی للمتقین"

"یعنی بے شک اس کتاب سے متقین رہبری حاصل کرتے ہیں"۔

۳۔ قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین ھٰذا بیان للناس وھدی وموعظۃ للمتقین"۔

"یعنی تم سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں۔ دنیا کی سیر کرو اور دیکھو کہ غلط راہوں پر چلنے والوں کا کیا انجام ہوا۔ یہ باتیں اور ہدایتیں ان لوگوں کے لئے ہیں جو متقین میں سے ہیں"۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ وہ راسخ فی العلم۔ اولی الالباب اور متقین جنھیں قرآن پاک میں مخاطب کیا گیا کون لوگ ہیں؟ دنیا میں شاید مشکل ہی سے کوئی ایسا آدمی ہو جو خود کو عقل اور حسن سے عاری سمجھتا ہو۔ ملاّ ازم

کے مبلغین بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ مطلوبہ صفات سے موصوف ہیں چنانچہ ان آیات کے مخاطب وہی ہیں لیکن کوئی خودساختہ کسوٹی کام کی نہیں ۔ قرآن پاک کی ذکر کردہ آیات میں خود ہی صحیح مخاطبین کی نشاندہی کردی گئی ہے اور واضح طور پر بیان کردیا گیا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں :

۱۔ جو تشبیہی آیات کے ذریعہ فتنہ و فساد اور نفرت و تعصب کو جنم نہیں دیتے یعنی جو محکم اور بنیادی آیات کی پیروی میں انسانی اتحاد۔ امن اور فلاح و بہبود کی باتوں کو تقویت پہونچاتے ہیں۔

۲۔ جو اچھی طرح غور و فکر کئے بغیر کسی بھی بات کے بارے میں کوئی رائے، فیصلہ یا اعتقاد قائم نہیں کرتے۔

۳۔ جو مشاہدہ یا مطالعہ کے ذریعہ دنیا کی موجودہ اور گذشتہ اقوام کے حالات کا علم حاصل کرتے ہیں ۔ ان کے عروج و زوال کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں اور ان سے سبق یا عبرت حاصل کرتے ہیں ۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کے سارے لوگ ایک جیسی عقل، صلاحیت اور لیاقت نہیں رکھتے ۔ بعضے توہم پرست اور جاہل ہوتے ہیں بعضے آزاد خیال اور عالم، کچھ شقی القلب ہوتے ہیں اور کچھ رحمدل۔ کوئی خودغرض اور مفاد پرست ہوتا ہے تو کوئی بے لوث اور ایثار پیشہ۔ دونوں ہی طرح کے رنگ ملتے ہیں۔ یہی حال لوگوں کے رجحانات اور طریقۂ کار کا بھی ہے۔ یہ تضاد ابتدائے آفرینش سے چلا آرہا ہے۔

دنیا کے ہر مذہب کے پیروؤں میں بھی اسی تضاد کے سبب بنیادی طور پر دو طرح کے لوگ ہوتے آئے ہیں ایک گروہ مذہب کی ظاہری باتوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہے دوسرا گروہ باطنی تعلیم اور اس کے اصل مقصد کو۔ پہلی قسم کے گروہ میں جادوگر۔ کاہن۔ پنڈت۔ ملا۔ پادری۔ اور دوسری قسم کے گروہ میں دانا حکیم۔ نبی پیغمبر اور رشی وغیرہ آجاتے ہیں۔

ولی اللہ - درویش - راہب، سنت اور جوگی وغیرہ شمار ہوتے ہیں چونکہ اکثریت ہمیشہ سے
توہم پرست، جاہل - فکر و فہم سے عاری اور آسانی پسند رہتی آئی ہے اس لئے
پہلی قسم کے گروہ نے ان کی پسند کے مطابق مذہب کو ظاہرداریوں - توہمات
اور رسوم سے بھر دیا چنانچہ ان باتوں کا دور دورہ عام ہو گیا - لیکن چونکہ
صاحبِ فہم اور حقیقت پرست افراد ہمیشہ اقلیت میں رہتے آئے ہیں -
اس لئے دوسری قسم کے گروہ نے اپنی اصل تعلیمات کو صرف صاحب ظرف
لوگوں تک محدود رکھا یوں ان کے نظریات واضح صورت میں زیادہ نہ پھیل سکے -
تاہم اگر دنیا میں اس گروہ کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا
کہ ان کی تعلیمات کی یادگاریں اور اثرات ہر مذہب ہر قوم اور ہر ملک میں
نظر آئیں گے - یونان - مصر - عرب - ایران - چین اور ہندوستان میں یہ
آثارات خاصے نمایاں ہیں - بہرحال مذہب - رنگ - نسل اور ملک کے مختلف
ہونے کے باوجود ساری دنیا میں اس گروہ کے بنیادی عقاید و اصول تقریباً
یکساں چلے آ رہے ہیں -

مسلم صوفیائے کرام نے اسلام کی تعبیر کی بنیاد عشق و معرفت پر رکھی ہے -
اس عشق و معرفت پر جس کی کوئی انتہا یا حد مقرر نہیں جو زندگی کی طرح ہمیشہ
متحرک اور مائل بہ ارتقاء رہتا ہے - سچ کہا ہے شاہ لطیف علیہ الرحمتہ نے -

نکو سنڌو سور جو، نکو ميڙ هو سڪ،
عدد نہ آهي عشق، پڄاڻي پاڻ لهي.

"نہ لذتِ غم ہی کی کوئی حد رہتی ہے نہ بیتابیٔ شوق کی عشقِ عدد نہیں
کہ کوئی اس کا تخمینہ لگا سکے - اپنی انتہا کو صرف وہی پا سکتا ہے"

صوفیائے عظام کے تئیں آنحضرت صلعم نے اصلاحِ فرد و معاشرہ
کی خاطر وقتی حالات کے پیشِ نظر عامۃ الناس کو جو ہدایات دیں انھوں نے
قوانینِ شریعت کا روپ دھار لیا اور جو ہدایات اہلِ ظرف و نظر کو دی گئیں

انھوں نے مسلکِ طریقت کا نام پایا۔ آنحضرت صلعم کی ذاتِ اقدس صوفیائے کرام کے لئے شہرِ علم و معرفت جیسی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی ذاتِ بابرکت اس شہر کے دروازے جیسی ہے۔ طریقت کے سارے سلسلے اس دروازے سے اسی شہر میں داخل ہوتے ہیں۔

صوفیائے کرام دو قسم کے گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک گروہ ان بزرگوں کا ہے جنھوں نے اپنے سلسلوں کو بیعت و خلافت کی بنیادوں پر منظم کیا اور مریدوں کے نفس و اخلاق کی تطہیر کو اپنا شعار بنایا۔ دوسرا گروہ ان اہل حق پر مشتمل ہے جنھوں نے حقیقت الاشیاء کے علم اور نوع انسانی کے مجموعی مفاد یعنی اتحاد۔ امن اور ترقی کے لیے زندگیاں صرف کیں۔

پہلا گروہ :- صوفیاء کے اس گروہ میں چار خاص سلسلے پیدا ہوئے۔ قادری، سہروردی، چشتی اور نقشبندی۔ ان سلسلوں کے بزرگوں نے اپنے اپنے طریقہ پر لوگوں کو اصلاح نفس و اخلاق کی خاطر توکل و قناعت، صبر و شکر اور خوش گفتاری و خوش کرداری اختیار کرنے کی اور تعصب و نفرت اور بغض و تشدد وغیرہ سے پرہیز کرنے کی تلقین کی۔

حضرت جنید بغدادی۔ حضرت شبلی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت شیخ ابونجیب سہروردی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری اور حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی۔ ان سلسلوں کے مقتدر بزرگ ہیں۔ ان بزرگوں نے اپنی تعلیمات سے نہ صرف باشعور اور تعلیم یافتہ لوگوں کو متاثر کیا بلکہ عوام کی خاصی تعداد کو بھی اپنی جانب راغب کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس سلسلہ میں ان بزرگوں کی پالیسی یہ رہی ہے کہ مذہب کے ظاہری رسوم و عقاید کے الجھاوؤں کو نظرانداز کرکے ان پر عمل کرتے ہوئے بھی لوگوں کی اصلاح کی جائے۔ ان بزرگوں نے عوام الناس کے نفس و اخلاق کی درستگی کے لئے بہت کچھ کیا۔

دوسرا گروہ :- اس قسم کے گروہ صوفیاء میں وہ بزرگ آجاتے ہیں جنھوں

نے اپنے خاص حلقۂ ارادت کو منظم کرنے اور اپنی تعلیمات کو ان کے دائروں تک محدود کرنے کو ضروری نہ سمجھا۔ مذہب کے ظاہری عقاید و رسوم اپنی افادیت کھو دینے اور نقصان کار ثابت ہونے کی وجہ سے ان کی نگاہوں میں غیر ضروری ہو گئے۔ انھوں نے آزادانہ طور پر غور و فکر اور علم و تحقیق کے ذریعہ ہر بات کی اصل تہ تک پہونچنے کی کوشش کی۔ اور اہم ترین سوالات جیسے کہ زندگی کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ کائنات اور حیات بعد الممات کی صداقت کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ کے جوابات معلوم کرنے پر توجہ دی۔

اس سلسلہ میں ان بزرگوں نے مصر۔ ایران۔ یونان۔ عرب اور ہند کے قدیم فلاسفر اور اہل طریقت کی معلومات سے بھی استفادہ کیا اور خود بھی اس پر غور و خوض کیا۔ اسی وسیع تحقیق و تفتیش اور تجزیہ و موازنہ کے ذریعہ انھوں نے کثرتِ مذاہب و عقیدہ کے پس منظر میں کار فرما بنیادی وحدت کا راز دریافت کیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرفان صداقت کے سبب انھوں نے جرات و حوصلہ سے کام لیا۔ مذاہب کے ظاہری عقاید و رسوم کو بے مقصد ٹھہرایا اور اصل حقیقت کا کھل کر اظہار کیا۔

وہ معلوم کر چکے تھے کہ مذاہب کی اصل غایت اتحاد و مساوات انسانی۔ امنِ عالم اور ترقیٔ بنی آدم ہے اور روایتی عقاید و رسوم کو اصل مذہب قرار دینے کی وجہ سے اس غایتِ حقیقی کی راہوں میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ ہر مذہبی گروہ ایک الگ مفادی گروہ بن گیا ہے۔ جن کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ اور دنیا جائے امن کے بجائے گہوارۂ فسادات بن کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ اس صورتِ حال میں اپنے لئے انھوں نے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ پایا کہ وحدت کی تعلیم کو اپنا شعار بنائیں اور زندگی اسی مقصد اعلیٰ کے لئے وقف کر دیں اور انھوں نے یہی کیا۔ ان کی اسی کیفیت کو ایک شاعر نے یہ کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

رند روز شب آهن سدا، وحدت جي وادي ۾ غرق

(رندانِ بزمِ معرفت کا کیا بیان کیا جائے وہ دن رات ہمیشہ بادۂ وحدت سے سرشار رہتے ہیں)

ان بزرگوں میں سے ایک گروہ مجذوبین کا تھا دوسرا سالکین کا ۔ دونوں ہی وحدت الوجود (ویدانت) کے قائل تھے ۔ دونوں ہی عشق و معرفت سے سرشار تھے ۔ فرق صرف پیرایۂ اظہار کا تھا۔ گروہِ مجذوبین کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور وحدت الوجود کی کھلی تبلیغ کے ساتھ "ملّا ازم" پر بھی کھلی تنقید کرتا تھا۔ اور گروہِ سالکین یہ تبلیغ و تنقید اشاروں کنایوں سے تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ کرتا تھا ۔ اوّل الذکر گروہ کے رہنماؤں میں منصور حلاج، خواجہ فریدالدین عطار، شمس تبریز، شیخ محی الدین ابن عربی، سرمد شہید، شاہ عنایت شہید اور سچل سرمست وغیرہم شامل ہیں ۔ اور ثانی الذکر گروہ کے بزرگوں میں مولانا روم ۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ لطیف بھٹائی وغیرہم مثالی حیثیت رکھتے ہیں ۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب میں صوفیائے کرام کے ان دونوں گروہوں کے مشترکہ عقاید کا اجمالی خاکہ پیش کروں گا ۔

صوفی کا پہلا عقیدہ

وحدت الوجود پر ایمان رکھنے والے صوفیائے کرام کا پہلا اہم عقیدہ یہ ہے کہ "جملہ مذاہب کے پسِ منظر میں بنیادی وحدت کارفرما ہے"۔ اس عقیدہ کے دو پہلو ہیں ۔

(الف) اللہ تعالیٰ نے ، ہر ملک، قوم اور زمانے میں نوعِ انسانی کی اصلاح و تعلیم کے لیے پیغمبر، ولی، حکیم، دانا اور برگزیدہ اشخاص مامور کیے ہیں ۔

(ب) ان کی تعلیمات میں کچھ باتیں بنیادی اور دائمی نوعیت کی ہوتی ہیں، اور کچھ فروعی اور وقتی۔

(الف) ہر دور میں برگزیدہ افراد کا آنا:- اس عقیدہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ صوفی کائنات کی پیدائش اور اس کے نظام کو حادثہ نہیں تصوّر کرتا۔ اس کے کانوں میں "مَا خلقتَ هٰذا باطلاً" (کیا یہ ساری کائنات بے مقصد بنائی گئی ہے) کی صدا گونجتی رہتی ہے۔ وہ کائنات کی تخلیق اور اس کے نظام میں ایک منضبط منصوبہ دیکھتا ہے۔ اور اسی بنا پر اُسے اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ اس سارے معاملہ کے پسِ منظر میں ایک اعلیٰ وارفع طاقت کارفرما ہے۔ پیغمبرِ خدا نے اسی طاقت کے ذاتی نام کو اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ دیگر مذاہب نے بھی اسی طرح اس طاقت کو مختلف نام دیے ہیں۔ اہلِ مذہب اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسی طاقت کے منصوبہ کے مطابق بعض اشیا ظہور میں آتی ہیں۔ کچھ عرصہ اپنی خاص شکل میں قائم رہتی ہیں اور پھر اس کے بعد اس شکل میں ختم ہو کر مختلف دوسری صورتیں اختیار کرتی ہیں یا اُن میں جذب ہو جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اولیائے کرام نے اس طاقت۔ اس کے منصوبے اور ان منصوبوں کے مقاصد پر علم و عقل اور شعور و ادراک کے ساتھ یکسوئی سے غور و فکر کر کے صداقت کے اس بحرِ عمیق سے کچھ گوہرِ مراد حاصل کیے ہیں۔ لیکن نہ وہ اس حاصل شدہ دولتِ بے بہا پر اپنی یا کسی اور کی اجارہ داری قائم کرتے ہیں اور نہ وہ کسی کو اس گنجِ عظیم کا پتہ ٹھکانا بتانے میں کسی بخل یا تنگ نظری سے کام لیتے ہیں، اس کے برعکس وہ ہر ایک کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور قسمت آزمائی کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جیسا کہ شاہ لطیف علیہ الرحمہ بہ بانگِ دہل فرماتے ہیں:-

شيوا ڪر سمونڊ جي، جت جر وهي تو جال،
موين سپجن سمونڊ ۾، مانڪ موتي لعل،
جي ماسو جڙئي مال، ته ڀوڇارا ڀر تيئن.

"اگر غنی، کامل ہونا چاہتے ہو تو بحرِ حقیقت میں غوطہ زنی کا حوصلہ پیدا کرو، جس کی بے کنار سطح پر لامتناہی موجیں جوش دکھایا کرتی ہیں۔ اس کی تہ میں معرفت کے بے بہا خزانے پوشیدہ ہیں۔ اگر تمھیں ان کا کوئی ادنیٰ ترین حصہ بھی نصیب ہو گیا تو مالا مال ہو جاؤ گے۔"

جس طرح کائنات اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ اسی طرح ان کے بارے میں معلومات اور انکشافات کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رہنے والا ہے۔ ان کی انتہا اور قطعیت کا علم ذاتِ حقیقی کے سوا دوسروں کو بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے۔ "یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔" یعنی اے پیغمبر! لوگ تم سے روح (رازِ حقیقت) کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو یہ امر ربی ہے لوگوں کو اس بات کا بہت کم علم ہو سکتا ہے۔ اور تو واقعہ ہے کہ نبی پیغمبر، حکیم، فلاسفر، سائنسداں اور اہلِ معرفت گنجِ حقیقت کے صرف چند دانے ہی حاصل کر پاتے ہیں۔ یہی سعیِ حاصل و لاحاصل انھیں مطمئن اور بے چین رکھتی ہے اور یوں تجسّس و انکشافات اور تعلیم و تحقیقات کے مرحلے ہر دور میں جاری رہتے ہیں۔

(ب) **برگزیدہ اشخاص کی تعلیمات:**۔ ہر دور کے برگزیدہ افراد کی تعلیمات دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ ایک حصہ حقیقتِ کائنات اور مقصدِ حیات سے متعلق ہے۔ دوسرا حالات کے تقاضوں کے مطابق معاشرہ کی تنظیم و فلاح سے متعلق۔ ان میں پہلی قسم کے مسائل کی نوعیت دائمی اور بنیادی ہے۔ اور دوسری قسم کے امور سے متعلق ہدایات و تعلیمات عارضی اور فروعی نوعیت رکھتی ہیں۔

دائمی اور بنیادی نوعیت رکھنے والے مسائل دو اجزاء پر منقسم ہیں۔ ایک حقیقتِ کائنات سے متعلق اور دوسرا مقصدِ حیات سے متعلق۔ یہاں پہلے میں انہی دونوں اجزاء کے بارے میں مختصراً بیان کروں گا۔

۱۔ **حقیقتِ کائنات:**۔ اس موضوع سے میری مراد وہ سارے سوالات ہیں،

جو موجوداتِ عالم، خلقتِ اشیاء اور روح و مادّہ (جسم و جوہر) وغیرہ کی حیثیت سے متعلق ہوتے ہیں۔ کائنات کے اَسرار اور ان کی حقیقت کے علم کو صوفی بحرِ عمیق یا صحرائے بے کنارے سے تشبیہہ دیتا ہے۔ اور اس کی گہرائیوں اور وسعتوں میں گم ہوتا چلا جاتا ہے۔ کسی جانب اُسے حیرت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا لیکن وہ آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے، بقولِ حافظ شیرازی ؎

کس ندانست کہ منزل گہِ معشوق کجا است
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

یا جیسا کہ ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں۔

در ہر طرف کہ رفتم جز حیرتم نیفزود
فریاد زیں بیاباں و زراہِ بے نہایت

بلاشبہ جویائے حقیقت اپنی اس کاوشِ پیہم کے نتیجے میں اَسرارِ الٰہی کی انتہا تک نہیں پہنچ پاتا۔ مگر قدم قدم پر اُسے اُن کی وسعتوں کا جو عرفان حاصل ہوتا ہے اُس سے اُس کے جذبۂ تجسس میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ذوقِ جہت کو بھی تسکین حاصل ہوتی رہتی ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی رح اسی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ڪوليان ڪوليان ۾ لھان، شال ۾ ملان ھوت،
من اندر جا اوڄ، سا ملڻ سان ماڻي ٿئي.

"یعنی مطلوب کی تلاش میں ہر وقت ہی سرگرداں رہتا ہوں۔ اس ذوقِ تجسس نے دل میں ایک وجد آور جذبۂ شوق پیدا کر رکھا ہے۔ اچھّا ہو جو اب وہ مجھے نہ ملے۔ ایسا نہ ہو کہ ملنے سے یہ جذبہ ہی سرد پڑ جائے"

۲۔ **مقصدِ حیات** :۔ صوفی زندگی کا مقصد کائنات کی راہِ ارتقاء پر ہونے والی مسلسل جدوجہد میں دیکھتا ہے اور عشق و محبّت کو اس ارتقاء اور جدوجہد کی صالح اساس قرار دیتا ہے۔ یہی اساس اُسے ہر مذہب کی روح

محسوس ہوتی ہے اور اسی کو اصل محور قرار دیتے ہوئے وہ چند ایسے فطری اور بنیادی اصول وضع کرتا ہے جو سفرِ عشق و محبت کے راہ نما اور مقاصد ٹھہرتے ہیں۔ اُسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ یہ مقاصد کب حاصل ہوں گے اُسے تو بس اس بات کی دھن رہتی ہے کہ وہ ثابت قدمی کے ساتھ اس راہ پر زندگی بھر چلتا رہے اور دوسروں کو اپنا ہمسفر ہونے کی دعوت دیتا رہے۔ نہ وہ کشمکشِ حیات سے دل برداشتہ ہوتا ہے نہ ہی روشن مستقبل کی اُمید سے مایوس ہوتا ہے۔ اُسے اپنے پیغام کی سچائی پر یقین ہوتا ہے اور بقولِ شاہ لطیف بھٹائیؒ اس بات پر بھی اطمینان ظاہر کرتا ہے کہ :-

"جي قيام ميڙون، ته به ويجها پانڄ پرين."

"یعنی اگر وہ محبوب (مطلوبہ مقاصد) روزِ قیامت بھی مل جائے تو بھی اُسے دور نہیں سمجھنا چاہیے۔"

فروعی اور عارضی نوعیت کی ہدایتیں :- برگزیدہ اشخاص کی وہ ہدایات و تعلیمات جو وقتی حالات کے مطابق معاشرہ کی تنظیم و فلاح سے متعلق رہی ہیں انھیں بھی تین اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے۔

(۱) عقاید سے تعلق رکھنے والی باتیں (۲) باہمی تعلقات سے واسطہ رکھنے والی ہدایتیں۔ (۳) رسومات و عبادات کی تلقین۔

۱۔ عقاید سے متعلقہ باتیں :- دورِ وحشت ہی سے انسانی ذہن و مزاج میں جزا و سزا، انعام و عتاب اور خوف و لالچ کے تصوّرات کا گہرا اثر رہا ہے۔ یہ اثرات اتنے شدید اور ہمہ گیر رہے ہیں کہ انھیں یکسر ختم کرنا عملی نا ممکن رہا ہے۔ برگزیدہ اشخاص اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے چنانچہ جن جن توہّمات کو وہ آسانی سے ختم کر سکتے تھے انھیں تو اُنھوں نے فی الفور ختم کر دیا، لیکن جن تصوّرات کی جڑیں گہری تھیں انھیں امکان کی حد تک تحلیل و تبدیل کر کے اُس سے اُنھوں نے لوگوں اور معاشرہ کی اصلاح کا کام لیا۔ جو لوگ طاقت اور دولت رکھتے تھے

انھوں نے عامۃ الناس کی ان کمزوریوں کو اپنا اقتدار اور ملکی نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے استعمال کیا۔ اور جو لوگ طاقت و دولت کے بجائے عقل و علم کی نعمتوں سے سرفراز تھے وہ ان توہمات کو معاشرہ کی اصلاح و تنظیم اور مذہب کے فروغ کے لئے کام میں لائے۔

اس سلسلہ میں اہلِ اقتدار نے قدیم قبائلی روایات اور شخصی و طبقاتی مفاد کے پیشِ نظر ملکی و سماجی نظام کے لیے جو اصول ٹھہرائے وہ آگے چل کر ضابطے اور قوانین کہلائے۔ اور مذہبی رہنماؤں نے گناہ و ثواب، نیک و بد اور جزا و سزا کے جو دستور بنائے انھیں شریعت کا نام دیا گیا۔ دیکھا جائے تو ان دونوں اقسام کے ضابطوں کے بنیادی محرک جذبے Incentives بیم و رجا پر ہی مدار رکھتے ہیں۔ ان میں فرق صرف اس بات کا ہے کہ اہلِ اقتدار کا مقرر کردہ عذاب و انعام دنیا اور زندگی ہی میں مل جاتا ہے اور اہلِ مذہب کی بشارت کردہ سزا و جزا عاقبت میں یعنی مرنے کے بعد بہشت و دوزخ میں ملتی ہے۔ اہلِ اقتدار میں ظالم اور خود غرض افراد کی اکثریت تھی اور مذہبی رہنما نرم دل اور انسانیت دوست تھے۔

بسا اوقات مذہب اور اقتدار کے یہ دونوں ادارے الگ الگ بھی چلتے رہے ہیں۔ لیکن بعد میں مفادات کی یکسانیت کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے سے تعاون کیا ہے۔ ایسی صورت میں اہلِ اقتدار ہی کو غلبہ حاصل رہا ہے۔ اور مذہبی رہنماؤں کی حیثیت ثانوی رہی ہے۔ اسی وجہ سے مذہبی رہنماؤں کو زیادہ تر حکامِ وقت کی مرضی کے مطابق کام کرنا پڑا ہے اور ضرورت پر ان کی خواہش کے مطابق مذہب کی تشریح پیش کرنی پڑی ہے۔ اس کے علاوہ عامۃ الناس نے بھی حکامِ وقت کی عنایت و ناراضگی کے نتائج کو نقد اور مذہبی رہنماؤں کے جزا و سزا کے وعدوں کو ادھار جان کر حکامِ وقت کی خوشنودی کو زیادہ اہمیت دی۔

جب تک ان دونوں گروہوں نے اقتدار اور مذہب کو اپنے ذاتی اور طبقاتی

مفاد کے لیے حد سے زیادہ استحصال نہیں کیا۔ عوام الناس ان کے معمولی مظالم اور خود غرضیاں
کو برداشت کرتے رہے۔ مگر جب دونوں کا یا ان میں سے کسی ایک گروہ کا ظلم واستحصال
حد سے گزر جاتا تو کچھ نہ کچھ غیرت مند اور مظلوم دوست افراد ان کے خلاف اٹھ کھڑے
ہوتے اور بغاوت یا کم از کم احتجاج کا نعرہ بلند کرتے۔

گزشتہ پانچ سو برسوں میں دنیا کی حالت پہلے سے بے حد تبدیل ہو چکی ہے۔ اکثر
ممالک کی سماجی زندگی یکسر بدل چکی ہے۔ لوگوں نے روایت پرستی سے ہٹ کر
دنیاوی دساتیر پر ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کیا ہے۔ اس غور و فکر کے نتیجے
میں پہلے مغربی ممالک میں اور اس کے بعد دیگر ممالک میں جمہوری حکومتوں کا قیام
عمل میں آیا ہے اور سیاست کو مذہب سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ مذہب کو افراد کا
ذاتی اور عاقبتی معاملہ قرار دیا گیا ہے اور اوہام و عقاید کو عقل کی کسوٹی پر جانچا جانے
لگا ہے۔

دنیا کے بیشتر مسلم ممالک نے بھی یہی فکر و عمل کی راہ اپنائی ہے لے دے کے بس
ایک پاکستان ہی وہ بڑا مسلم ملک رہ گیا ہے جہاں دنیا اور ملکی معاشرہ کی زبردست
تبدیلیوں کے باوجود آج بھی بعض مفاد پرست گروہ اور ان کے انعام و عطیات
پر پرورش پانے والے ملا مذہب کو سیاسی استحصال کا ذریعہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔
میں صفحاتِ گزشتہ میں عرض کر آیا ہوں کہ ملّا ازم کے بیشتر عقاید و رسوم عقل و علم
کے پیمانوں پر غلط فرسودہ اور بیکار ہو چکے ہیں۔ بلا شبہ ان میں کی کچھ باتیں اپنے دور
کی ضروریات کے تقاضوں کے مطابق رہی ہیں۔ لیکن آج کے تبدیل شدہ معاشرہ
اور اس کے تقاضوں میں وہ اپنی افادیت کھو چکی ہیں۔ اور خود اسلام کی عزت و
وقار کی خاطر بھی انھیں خیر باد کہنا ضروری ہو گیا ہے۔ لیکن چونکہ اقتدار پسند طبقہ اور
ملا دونوں ہی اپنے ذاتی مفادات کے لیے ان روایتی عقاید اور نمائشی رسوم کو مفید ترین
آلۂ کار سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ انھیں باتوں کا راگ الاپے جا رہے ہیں۔ سچ کہا ہے
عبداللہ خواب نے ؎

ملوڪيت ۽ ملا- لازم و ملزوم آهن پئي،
جيئانو جن اجا پوريءَ طرح قرآن ني ناهي.

یعنی ملوکیت اور ملاازم دونوں لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنی خودغرضیوں کی وجہ سے دونوں ہی قرآن پاک کی تعلیمات کو صحیح طور پر سمجھنے سمجھانے سے معذور رہیں۔ ملاازم کی خلاف اسلامی تعلیمات کے بارے میں یہ شکایت محض آج ہی کے دور کے سچے اسلام دوستوں کو نہیں بلکہ ماضی میں بھی وقتاً فوقتاً ایسی آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں اور مفاد پرستوں کے آلۂ کار ملاؤں کے کردار کو بے نقاب کیا جاتا رہا ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ملين متو ماڪ، پتو قنس پيٽ ۾،
جيئي الله، نبي ڏنانين ڏوڙ ۾.

"یعنی ملاؤں نے معاشرہ میں زہر پھیلا دیا ہے۔ وہ حق کو جانتے ہوئے بھی اپنے مفاد کی خاطر جھوٹ بول رہے ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے ان کا پتہ پیٹ میں ہی پھٹ گیا ہے اور وہ دھول میں ڈبکی لگا رہے ہیں۔"

اسی طرح منصورِ سندھ حضرت سچل سرمست نے ان گندم نما جو فروشوں کے بارے میں فرمایا ہے ؎

منجهايو ماڻهن کي، ماضين، مذهبن،
محڪم ماڻهن کي ڪيو، تن جي زنجيرن،
هون حديثن ڪينڪي، نہ ۾ آيتن،
معني تن کي ڪين، تيو ملا تا معين،
سي سوکها تپشي ڪيا، نامراد نيرن.

"ماضی پرست مذاہب نے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے اور روایتی عقاید نے انھیں اوہام کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ آیات و احادیث کے معنی اور ان کا اصل مقصد نہ جاننے والے ملا کہلانے لگے۔ وہ خود تو گمراہ ہیں ہی مگر دوسروں

کو بھی گمراہ کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں"۔

سچ کہا ہے علامہ اقبال نے ؏

دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

۲۔ باہمی تعلقات سے واسطہ رکھنے والی ہدایتیں :۔ برگزیدہ افراد کی اس قسم کی ہدایتوں کا تعلق بنیادی طور پر اخلاق سے ہوتا ہے۔ انگریزی میں انھیں ETHICS کہا جاتا ہے۔ اور مذہبی اصطلاح میں انھیں شریعت یا فقہ کا نام دیا جاتا ہے۔

ہر دور، ہر علاقہ اور ہر مذہب وعقیدے کے معاشرہ میں کسی نہ کسی قسم کے سماجی یا اخلاقی ضابطے ہوتے آئے ہیں۔ لیکن ان سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے ہی سے یہ حقیقت آشکار ہوجائے گی کہ اس قسم کے ضابطوں میں زمانہ اور معاشرہ کے تغیّر کے ساتھ ہمیشہ تبدیلی ہوتی آئی ہے۔ سماج اور معاشرہ سے متعلق مذہبی قوانین بھی اس قانونِ تغیّر وارتقاء سے ماوریٰ نہیں ہیں۔ پیغمبروں، اوتاروں، مدبروں اور مصلحوں وغیرہم نے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ہمیشہ سابقہ اور رائج ضابطوں اور قاعدوں میں ترمیم واختراع سے کام لیا ہے۔ لیکن ان حقائق کے واضح علم کے باوجود ملّا ازم کے مبلغین اسلام کے مقدس نام پر آجکل کے مشینی اور صنعتی دور میں بدویانہ معاشرہ کے سماجی واخلاقی ضابطوں کو رائج کرنیکا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اور اسے ہی اصل اسلامی نظام قرار دے رہے ہیں۔

عامۃ الناس اور سادہ لوح مسلمان اس قسم کے نعروں سے بڑی حد تک غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اصل حقیقت جاننے والے لوگ جس حد تک ممکن ہو ان پھیلنے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

اس سلسلے میں پہلی بات جو یاد رکھنے کے لائق ہے یہ ہے کہ جیسا میں نے سطورِ بالا میں بیان کیا ہے، افراد اور معاشرہ سے متعلقہ قوانین یا ضابطے چاہے وہ حکومتوں

کے بنائے ہوئے ہوں یا مذاہب کے بنائے ہوئے۔ نہ وہ کبھی دائمی رہے ہیں اور نہ رہ سکتے ہیں۔ حالات اور معاشرہ کے بدلنے کے ساتھ ان میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ یہی قانونِ فطرت ہے اور یہ بات کسی دینِ فطرت کے خلاف نہیں ہو سکتی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ عامۃ الناس ناخواندہ ہونے کی وجہ سے نفسیاتی طور پر قدامت پسند ہوتے ہیں اور باپ دادا کے عقائد و رسوم سے دست بردار ہونے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتے۔ اس بات کے علاوہ اور جو خاص بات انھیں ماضی پرستی کی طرف لے جاتی ہے اُن کی یہ کمزوری ہوتی ہے کہ وہ اپنی عام مشکلات و پریشانیوں کا حل خود ہی تلاش کرنے کی خود اعتمادی سے محروم ہوتے ہیں۔ چنانچہ مسائل اور ان کے تقاضوں سے فرار حاصل کرکے وہ ماضی کی رومانی فضا میں پناہ لیتے ہیں۔ مفاد پرست عناصر عوام کی اس کمزوری سے دل کھول کر فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مفاد پرست عناصر اور ان کے نقیبوں کو اس بات کا یقین ہے کہ اگر وہ مذہب اور سیاست کو ماضی کی طرح ساتھ چلانے کے نعرہ کو مقبول بنانے میں کامیاب ہو گئے تو ایک تو ان کے موجودہ استحصالی مفادات کو عوام کے بڑھتے ہوئے شعور سے جو خطرہ لاحق ہو گیا ہے وہ دور ہو جائے گا۔ دوسرے مستقبل کا مذہبی و سیاسی اقتدار بھی انھیں حاصل ہو جائے گا جس کے ذریعہ وہ من مانے طریقے پر اپنے مفادات کو ترقی دے سکیں گے اور جو بھی ان کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرے گا اس کو دنیا اور دین کا مجرم ٹھہرا کر جیسی چاہیں گے عقوبت دیں گے۔ ماضی کی تاریخ ایسے لاتعداد روح فرسا مظالم کے واقعات سے بھرپور ہے۔ یہ حالات کی ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ اس دور اور معاشرہ میں جس میں کہ عدلیہ کو انتظامیہ کے اثرات سے پاک کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہو، مذہب کو بھی اقتدار کی تحویل میں دے دینے کی بات کی جائے۔ اور ملک و عوام کی ترقی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو نظر انداز کرکے انھیں مزید پسماندہ و بدحال بنانے کے لیے نمائشی عقائد و رسوم

اور فرسودہ اصول و ضوابط کو اسلامی نظام قرار دیا جائے۔

دورِ حاضرہ میں ہمارے معاشرہ کو جو مسائل در پیش ہیں ان کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم اُن سے فرار حاصل کریں اور ماضی کی گود میں پناہ ڈھونڈھیں۔ ماضی کے نظاموں میں ایسی ہی کوئی افادیت ہوتی تو ہم سے بھی پہلے ہمارے اجداد اور بزرگ کبھی انھیں ترک نہ کرتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خود اعتمادی سے کام لیں، اپنے دور کی زندگی اور اس کے تقاضوں کو سمجھیں اور جس طرح ہمارے اجداد نے اپنے دور کے حالات کے مطابق سابقہ دستوروں کو ترک کرکے نئے دستور بنائے اسی طرح ہم بھی حقیقت پسندی سے کام لے کر عوام اور ملک کی بہتری کی خاطر بہتر سے بہتر لائحہ عمل اپنائیں۔ اس سلسلہ میں یہ تین باتیں ہماری فوری اور خصوصی توجہ کی طالب ہیں۔

۱۔ عوام کی غربت اور بے روزگاری دور کرنے اور ان کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی تجاویز مرتب کرنا۔

۲۔ دنیا میں مروّج سیاسی نظاموں کا مطالعہ کرنا اور اُن میں سے بہترین نظام کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے ملک کا دستوری ڈھانچہ تیار کرنا۔

۳۔ اخلاقی اور سماجی ضوابط کو معاشرہ کے تقاضوں کے مطابق نئی شکل میں ڈھالنا۔

ملک و عوام کے سچے خیر خواہ، اسلام اور مسلمانوں کی سر بلندی کے مخلص تمنائی، صوفی مسلک افراد اور جدید علم و سائنس کی روشنی سے منوّر لوگ سبھی اِن تینوں باتوں کو ضروری اور لازمی خیال کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں مذاہب کی قدیم شریعتیں (اخلاقی و سماجی ضابطے) موجودہ معاشرہ کے تقاضے پورے نہیں کرتیں۔ ماضی کے دستور اور قاعدے اپنے عہد کی ضرورت کے مطابق تھے۔ انھیں موجودہ عہد کی ضرورت کے مطابق تبدیل ہونا چاہیئے۔

ان باتوں کی مخالفت صرف ایک مخصوص مفاد پرست طبقہ اور اس کے

نقیبوں کی جانب سے کی جارہی ہے۔ اسلام کے نام پر وہ ماضی کے قوانین کے نفاذ کی رٹ لگائے چلے جارہے ہیں اور اختلاف رکھنے والوں پر من مانے فتووں کی بوچھار کررہے ہیں۔ لیکن ان حضرات کا یہ عمل ہرگز تعجب خیز نہیں۔ واقفِ حال اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنے موجودہ ذاتی اور طبقاتی مفادات کو عوام کے بڑھتے ہوئے سماجی شعور سے محفوظ رکھنے اور مستقبل میں دین ودنیا کے اقتدار پر قبضہ جمانے کے لئے وہ مذہبی جنون کی آگ بھڑکانے کے سوا اور کرہی کیا سکتے ہیں۔ عقل وہوش اور معقولیت وانسانیت کا ان سے تعلق ہی کیا ہو سکتا ہے؟؟

۴۔ رسومات وعبادات کی تلقین :۔ انسان نفسیاتی طور پر دوسرے سارے جانداروں سے بہت زیادہ حساس یا جذباتی واقع ہوا ہے صدمہ واذیت، مصیبت ونقصان، خوف واندیشہ اور غم وغصہ وغیرہ اسے سکونِ خاطر اور طمانیت قلب سے محروم کردیتے ہیں اور وہ اضطراب وبے چینی کا شکار ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح ویدوں، حکیموں اور ڈاکٹروں نے جسمانی امراض کے علاج کی فکر کی ہے اسی طرح بعض برگزیدہ افراد نے انسان کو اس نفسیاتی پریشانی سے نجات دلانے یا اس کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بھی کچھ عارضی اور کچھ دائمی قسم کی تدابیر تجویز کی ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ جس طرح جسمانی امراض کے سلسلہ میں مختلف ادوار میں معلومات اور تجربات کی بنیاد پر مختلف طرح کے علاج اختیار کئے گئے جیسا کہ ایک زمانہ میں سنگھی لگانا، فصد کھولنا، داغنا، پرندوں اور جانوروں کی تازہ کھال مریض کے جسم پر چمٹانا۔ اذیت دینا۔ ٹونے ٹوٹکے کرنا اور جھاڑ پھونک کرنا وغیرہ وغیرہ عام تھا، مگر اب انھیں جاہلانہ قرار دے کر یونانی۔ ہومیوپیتھی اور ایلوپیتھی وغیرہ طرز کے علاج اپنائے جاتے ہیں، اسی طرح نفسیاتی پریشانی دور کرنے کے لئے بھی مختلف ادوار کے لوگوں کے احساس وافکار کے مطابق بعض طریقے ایجاد کئے گئے۔ پوجا پاٹ۔ بھجن کیرتن۔ عبادت وریاضت۔ دعا ومناجات۔ چلّے وظیفے۔ جاپ، ورد ونیاز۔

صدقہ و قربانی اور نقش و تعویذ وغیرہ سب اسی دائرہ میں آجاتے ہیں۔

مسلمانوں میں یہ سب باتیں کسی نہ کسی شکل میں رائج اور داخلِ عبادت ہیں لیکن سب سے زیادہ جس عبادت کو اہمیت دی جاتی ہے وہ نماز ہے۔ اسے دین کے ارکانِ خاص میں مقدم شمار کیا جاتا ہے اور شرطِ اسلام قرار دے کر کہا جاتا ہے ؎

روزِ محشر کہ جانگداز بود
اولیں پرسشِ نماز بود

"یعنی قیامت کے دن جو کہ بڑا ہولناک ہو گا سب سے پہلے نماز کا حساب پوچھا جائے گا"۔

ہر چند کہ نماز کی وہ اصلاحی اثر انگیزی عنقا ہو چکی ہے جو مخصوص عہد کے افکار و احساسات پر ہوا کرتی تھی۔ اور اب اس کی اصل غایت کو نظر انداز کر کے خود اسے ہی مقصود بالذات قرار دیا گیا ہے تاہم اب بھی رسمی طور پر اس کے کچھ فائدے بیان کئے جاتے ہیں جن میں سے خاص خاص یہ ہیں:

۱۔ خدا کی خوشنودی ۲۔ تزکیہ نفس ۳۔ سکونِ قلب ۴۔ آخرت کی سرخروئی۔
۵۔ گناہوں کی تلافی۔

آیئے اب افادیت سے متعلق ان عقاید میں سے ہر ایک کا الگ الگ تجزیہ کریں۔

۱۔ نماز سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

اس عقیدہ کی بنیاد خدا کے شخصی تصور پر ہے۔ جس کے مطابق اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی مانند ناراضگی اور خوشنودی کے جذبات کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ اپنی مخلوق کے ہر عمل پر نظر رکھتا ہے اور بعض باتوں سے خوش اور بعض سے ناراض ہوتا ہے۔ اسی لئے لوگوں پر حقوق اللہ کو واجب ٹھہرایا گیا ہے اور نماز حقوق اللہ میں داخل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اللہ انسان کو پیدا کرتا ہے۔ اسے زندگی عطا کرتا ہے۔ تندرست رکھتا ہے۔ حادثات سے بچاتا ہے۔ روزی دیتا ہے۔ نعمتوں سے نوازتا ہے وغیرہ وغیرہ چنانچہ ایک فرمانبردار اور صالح بندہ کی حیثیت سے ان نعمتوں کا شکر بجالانے کے لئے انسان پر خدا کی عبادت بجالانا فرض ہو جاتی ہے اور نماز افضل ترین عبادت ہے۔

حق شناس صوفی کے نزدیک خدا کا شخصی تصور ناقابلِ قبول ہے۔ اس کے بجائے وہ خدا کو شکل و جسم۔ زمان و مکان اور جذبات و صفاتِ انسانی سے پاک اور بلند سمجھتا ہے۔ وہ قائم بالذّات اور بے نیاز ہے۔ نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اُس نے کسی کو جنا ہے۔ اسے دنیا اور دنیا والوں کی کسی بات کی احتیاج نہیں۔ وہ خوشنودی اور ناراضگی اور ہر قسم کے انسانی جذبات سے منزّہ ہے۔ وہ ہر جگہ پر حاضر و ناظر اور رگِ جاں سے بھی قریب ہے۔ اس بارے میں صوفی کا آخری نکتہ یہ ہے کہ کائنات میں ذاتِ الٰہی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ اسی کا پرتو یا مظہرِ صفات ہے اور صفات کی ذات سے الگ کوئی ہستی نہیں۔ یہی وہ منزل ہے جس پر پہونچ کر صوفی نماز سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور حضرت بیدل علیہ الرحمۃ کی طرح پکار اٹھتا ہے:

سڀ ڇڏ پائون سانگ، ڪندا ڪوه نماز کي،
جيڏانهن عالم آسرو، تيڏانهن ڪن نہ تانگ،
نڪي پڙهن ڪلمو، نڪي ٻڌن ٻانگ،
لاهوتي ٿي لانگ، عدم کون اڳي ويا

"یعنی جنھوں نے حقیقت کو پالیا ہے انھوں نے سارے سوانگ چھوڑ دیئے ہیں۔ اب وہ نماز کو کیا کریں گے۔ ان کی تو سرشت ہی بدل گئی ہے۔ جن باتوں سے عام لوگ نجات کی اُمیدیں باندھتے ہیں ان کی طرف وہ دیکھتے بھی نہیں۔ کلمہ پڑھنا اور اذان سننا بھی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ان ساری ظاہری اور نمائشی باتوں سے بلند ہو کر وہ تو عدم سے بھی آگے جا پہونچے ہیں۔"

نماز سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے

تزکیۂ نفس سے مراد کثیف حیوانی جذبات و خواہشات سے نجات حاصل کرنا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ وہ کون سے سفلی جذبات ہیں جن سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ نفسانی خواہشات کیا ہیں؟ ان کے پیدا ہونے کی وجوہات کیا ہیں؟ یہاں ان کا تفصیلی ذکر اس مضمون کے دائرہ سے باہر ہو جائیگا۔ اس بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے خواہشمندوں کو علم نفسیات Psychology کی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ یہاں میں صرف یہ کہنا کافی سمجھوں گا کہ فطری خواہشات سے مکمل دستبرداری، اوّل تو انسان کی قدرت سے باہر ہے اور اگر کچھ لوگ کسی حد تک ایسا کر بھی لیں تو اس سے معاشرہ کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ بلکہ اس نوع کی اعتدال سے بڑھی ہوئی تبلیغ دوسروں کو بے عمل اور مردہ دل بنا دے گی۔ اعتدال کی حد تک فطری خواہشات کا ہونا بہرحال ضروری ہے۔ ہاں صحیح اور غلط کی تمیز قائم کرنا بیشک لازمی ہے۔ صوفیائے کرام نے نفس کو تین درجوں پر تقسیم کیا ہے۔ ایک نفس امارہ، دوسرا نفس لوامہ اور تیسرا نفسِ مطمئنہ۔

نفسِ امّارہ :- یہ نفس کا ارزل ترین درجہ ہے اس کے اثر میں اگر آدمی کی خواہشات بے لگام ہو جاتی ہیں اور وحشی جانور کی طرح اپنی خواہشات کو پورا کرنے کیلئے وہ کسی اصول اور کسی تمیز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ انسانی معاشرہ کی ساری برائیاں، اور انسان کے ہاتھوں انسان پر ہونے والی ساری افتادیں اسی کی پیداوار ہیں۔ دورِ وحشت میں اس کا بول بالا رہا ہے۔ اب ہرچند کہ اس کی خرابیوں کے ہزاروں سالہ تجربات کے سبب بے لگام خواہشات اور خود غرضیوں کو مختلف مذہبی اور سماجی ضابطوں کا خاصی حد تک پابند بنا دیا گیا ہے۔ پھر بھی انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے ملکی و علاقائی تعصبات، نسل و رنگ کے امتیازات، طاقت و دولت کے نشہ اور مذہب و نظریہ

کے جبر وغیرہ کے روپ میں نفسِ امارہ اب بھی اپنے جلوے دکھاتا رہتا ہے۔

نفسِ لوامّہ:- جس شخص کا نفس اس درجہ پر ہو وہ اپنی خواہشات وغرض کے سلسلہ میں اپنے قبیلہ جماعت یا علاقہ کے مسلّمہ ضابطوں کا احترام اور تجربات و روایات کے مطابق صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے لگ جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برے اور بھلے اور غلط اور صحیح کے بارے میں مختلف زمانوں، قبیلوں مذہبوں اور معاشروں میں مختلف معیار اور پیمانے رہے ہیں۔ چنانچہ متضاد مذہبی اور ملکی قوانین کے پیشِ نظر یہ بات آسان نہیں رہتی کہ بعض باتوں کے قطعی طور سے اچھے یا برے ہونے کے متعلق کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ تاہم اس درجہ نفس پر آدمی میں مختلف باتوں میں تمیز کرنے کی کچھ نہ کچھ صلاحیت ضرور رہتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا اس درجہ میں آدمی کی قوتِ ارادی اس حد تک مضبوط ہو جاتی ہے کہ وہ خواہش نفس پر پوری طرح قابو پاکر دستوری پابندیوں کا تابع ہو جاتا ہے؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ دراصل نفس کا یہی درجہ آدمی کو دورا ہے پر لاکھڑا کرتا ہے۔ اور وہ داخلی کشمکش کے ساتھ کبھی اخلاقی ضابطوں کی پابندی کی راہ اپناتا ہے۔ کبھی ان کا انحراف کرتے ہوئے تکمیلِ خواہشات کے راستہ پر قدم مارتا ہے۔ جن اصولوں کو تسلیم کرتا ہے دوسروں کے سامنے ان پر عمل بھی کرتا ہے لیکن اگر موقع مل جائے تو کسی مفاد یا خواہش کی خاطر چوری چھپے انھیں قربان بھی کر دیتا ہے، اور اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی جواز بھی گھڑ لیتا ہے۔

نفسِ مطمئنہ:- یہ نفس کا وہ ارفع درجہ ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اس درجہ نفس پر فائز لوگ نہ صرف غیر معمولی علم و دانش سے آراستہ ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کی قوتِ ارادی اور صلاحیتِ عمل اس مرتبہ پر پہنچی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات پر قابو رکھتے ہوئے غلط اور برے کاموں سے دور رہتے ہیں، تاہم اتفاقیہ لغزشوں سے انھیں بھی مبرا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ نفسِ مطمئنہ کے حامل بزرگوں سے بھی خطائیں سرزد ہو سکتی ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر نماز تزکیۂ نفس کرتی ہے تو اس سے یہ فائدہ ان تینوں میں سے کس درجۂ نفس پر فائز افراد کو ہو سکتا ہے ؟ ظاہر ہے کہ نفسِ مطمئنہ کے حامل افراد اس احتیاج سے بے نیاز ہیں اور یوں اس کی افادیت نفسِ لوّامہ اور نفسِ امّارہ کے تابع افراد کے لئے رہ جاتی ہے۔ لیکن اس طبع کے لوگوں کو بھی نماز کا یہ فائدہ صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب وہ حضورِ قلب، صدقِ خیال اور پوری یکسوئی کے ساتھ ادا کی جائے۔ نماز ادا کرنے والے کو اچھی طرح معلوم ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اور جو الفاظ وارکان وہ ادا کر رہا ہے اس کے کیا معنی ہیں۔ اُسے پوری طرح اس بات کا یقین ہو کہ وہ جس کی عبادت کر رہا ہے یا جس سے دعا مانگ رہا ہے وہ اس کے سامنے موجود ہے اور اس کیفیت کا اس پر اتنا اثر ہو کر وہ گرد وپیش سے بلکہ اپنے آپ سے بھی یکسر بے نیاز ہو جائے۔

اب ذرا ایمانداری سے جائزہ لیجئے۔ کتنے لوگ ہیں جو اس طرح نمازیں پڑھتے ہیں ؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ نفسِ امّارہ اور نفسِ لوامہ کے غلام۔ راشی۔ نفع خور۔ اسمگلر۔ غاصب۔ خائن۔ گندم نما جو فروش۔ بیشہ ور بگلہ بھگت اور اسی قبیل کے دوسرے بدکردار لوگ نماز کو محض ایک رسمی فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں اور اس کے ادائگی کے دوران بھی اپنے فاسد خیالات میں گم رہتے ہیں ؟ ایسی صورت میں کیا یہ بات ثابت نہیں ہو جاتی کہ نماز بدنفس لوگوں کی اصلاح نہیں کرتی ؟ نمائشی عبادت ورسوم کی افادیت کا یہی حال دیکھ کر شاہ باہو علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :

نفل نمازان کم زنانہ دے روزے صرفا روٹی، ھو-
مکے - دیول سوئی جاوے گھر دے ھوون توٹی، ھو-
آچیان بانگان سوئي ڈیون نیت جنھا دی کھوٹی، ھو-
کی پرواہ تنھا نون "باھو"، جنھان گھر وچ لدي بوٹي، ھو-

" یعنی نفل نمازیں عورتوں کے اشغال ہیں۔ روزے رکھنا گویا روٹی بچانا ہے حج کے لئے مکہ وہی جاتے ہیں جنھیں اپنے گھروں میں بے مائیگی کا احساس

ہوتا ہے ۔ اونچی بانگ وہ دیتے ہیں جن کی نیت کھوٹی ہوتی ہے ۔ ان نمائشی باتوں کی بھلا انہیں کیا پرواہ ہو سکتی ہے جنھوں نے خود اپنے اندر حقیقت کے راز کو پا لیا ہو"۔ شاہ لطیف بھٹائی علیہ الرحمہ اس بارے میں اپنے مخصوص انداز میں یوں ارشاد کرتے ہیں:-

روزا ۽ نمازون اي پڻ چڱو ڪم،
پر او ڪو ٻيو فهم، جنهن سان پسجي پرينءَ کي.

"یعنی روزے اور نمازیں بھی اچھا کام ہیں، لیکن جس بات سے محبوب حقیقی کی قربت حاصل ہوتی ہے وہ اور ہی کچھ ہے"۔

اس موضوع پر حضرت بُلّا شاہ کا ارشاد آپ ہی اپنا جواب ہے ۔ فرماتے ہیں:-

روزے حج نماز نے مائی
مینوں پیا نیں آں بھُلائی

"یعنی اے ماں! روزہ، نماز اور حج کی ظاہرداریوں نے تو مجھے محبوبِ حقیقی کی یاد ہی سے غافل کر دیا"۔

۳۔ نماز سے سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے

یہ امر واقعہ ہے کہ مصیبت، پریشانی، تکلیف اور اندیشوں کے نازک مواقع پر جب آدمی مایوس، مغموم اور بے بس ہوتا ہے تو ان لمحات میں اُسے غیبی امداد یا سہارے کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ایسے مواقع پر دعا یا عبادت اکثر دل کو سکون بخشتی ہے ۔ کتنے ہی لوگ ایسی حالتوں میں جانوروں، دریاؤں، دیوی دیوتاؤں اور خدا سے امداد کے طالب ہوتے ہیں ۔ ایسا کرنے سے ان کی مشکل اور مصیبت دور ہو جاتی ہے یا نہیں یہ الگ بات ہے، البتہ نفسیاتی طور پر بیشتر کو عارضی

اطمینانِ قلب ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی سبب سے دعا و عبادت کو اکثر مسکن Sedative اور مفرح Tranquillizer ادویات کے طور پر کام میں لایا گیا ہے۔

لیکن یہ مسلّمہ قاعدہ ہے کہ کسی بھی دوا کا بے موقع اور حد سے زیادہ استعمال اس کی افادیت کو کم یا ختم کر دیتا ہے۔ اور جس طرح کسی دوا کا عادی ہو جانے پر دوا زیادہ اثر نہیں کرتی اسی طرح محل بے محل اور بغیر کسی شدید ضرورت کے دعا و عبادت کی عادت بھی اپنا اثر کمزور کر دیتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے مواقع پر سکونِ قلب صرف نماز ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ہر مذہب کے پیروؤں کے دعا اور عبادت کے طریقے مختلف ہیں اور وہ سب اکثر ہنگامی مواقع پر مسکّن اور مفرّح ثابت ہوا کرتے ہیں۔

۴۔ نماز سے آخرت میں سُرخروئی حاصل ہوتی ہے

نماز کا چوتھا فائدہ عاقبت کی بھلائی بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن مُلّا آخرت کا جو تصور رکھتا ہے صوفی اُسے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ بہشت، دوزخ، پُل صراط، میزان اور قیامت وغیرہ تشبیہی چیزیں ہیں۔ اور جو لوگ لالچ یا خوف کے بغیر نیک راہ پر نہیں چل سکتے اُن کو درست کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہیں۔ ان چیزوں کا کوئی واقعی وجود نہیں اور جو چیز موجود ہی نہ ہو اس کے فائدے کے لیے عبادت کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ علاوہ ازیں صوفی عشقِ خدا میں مست ہوتا ہے۔ اس کا ہر عمل محبوبِ حقیقی کی منشا کے مطابق اور محبت کے لیے ہوتا ہے، آخرت کی سودے بازی کے لیے نہیں۔ عبادت و ریاضت اس کے نزدیک خلوتِ حبیب کے بے خود پُر کیف لمحات کے معنی تو رکھتی ہے، لیکن کسی نفع کی توقع پر ایسا کرنا اس کے اصول کے خلاف ہے۔

۵. نماز سے گناہوں کی تلافی ہوتی ہے

نماز کے فائدہ کا یہ پانچواں تصور بھی صوفی اور حق شناسوں کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سماجی گناہ خدا کی عبادت کرنے سے ہرگز معاف نہیں ہو سکتے۔ اگر ملّا کے اس عقیدہ کو مان لیا جائے تو پھر انصافِ خداوندی مذاق بن کر رہ جائیگا۔ اور ہر شخص چوری، ڈاکہ، دھوکہ بازی، ملاوٹ، چور بازاری، رشوت خوری ذخیرہ اندوزی ظلم، استحصال اور ایسی ہی ساری سماجی برائیوں کا ارتکاب کرتے ہوئے بھی عبادت کے ذریعہ خدا کی معافی کی توقع کر سکتا ہے۔ ایسا اعتقاد رکھنے والے شاید یہ نہیں جانتے کہ خدا ہرگز ایسا نہیں ہے کہ اپنے بندوں کے ساتھ ظلم کرنے والوں کی خوشامد یا رشوت کے طور پر ادا کی جانے والی عبادت سے خوش ہو کر اُن کے گناہوں کو معاف کر دیگا۔

نماز اور عبادت میں آئندہ کے گناہوں سے بیزاری اور توبہ کے سچّے جذبات تو کچھ معنی رکھتے ہیں لیکن کئے ہوئے سماجی جرائم کے معاف ہو جانے کی اُمیدیں خدا کے منصف اور عادل ہونے کے عقیدے کو غلط قرار دینے کے مترادف ہیں۔ اس قسم کے غلط عقیدہ کی وجہ سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لوگ دل کھول کر سماجی و اخلاقی گناہ بھی کرتے رہتے ہیں اور انھیں معاف کرانے کے لیے عبادت بھی کرتے جاتے ہیں۔ صوفی ایسے لوگوں کو منافق قرار دیتا ہے۔ دراصل یہ ریاکاری کے علاوہ کچھ اور ہے بھی نہیں۔ اہلِ ظاہر کی انھیں ریاکاریوں سے متاثر ہو کر شاہ باہو علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

پڑھ پڑھ علم مشائخ سڈاون کرن عبادت دوري، هو-
اندر جهگي هٺي لٽيوي، تن من خبر نه موري، هو-
مولا والي سدا سوکالي، دل تون لاهه تکوري، هو-
"باهو" رب تنهان نون حاصل، جنهان جگ نه
کيتي چوري، هو-

"یعنی قرآن پڑھ کر حافظ تکبّر کرتے ہیں اور ملا نمازیں پڑھ کر فخر جتلاتے ہیں۔ وہ کتابیں بغل میں دبا کر اتراتے ہوئے گلیوں سے گزرتے ہیں اور جہاں بھی فائدے کی کوئی اُمید پاتے ہیں کلام کو اونچے سروں میں الاپنے لگتے ہیں۔ بالآخر جنھوں نے اپنی کمائی اس طرح بیچ دی اُن کے دونوں ہی جہان برباد ہوئے۔"

نماز کی طرح دیگر ظاہری عبادات و رسوم کو بھی جو صرف روایت بن کر رہ گئی ہیں صوفی بے فائدہ سمجھتا ہے۔ حج کرنا، قربانی دینا، قبور پر جا کر دعائیں مانگنا، ورد و وظائف کرنا، نذر و فاتحہ کرنا اور جھاڑ پھونک وغیرہ سب کو وہ نمائشی اور رسمی کارروائیاں سمجھتے ہوئے بے فائدہ تصور کرتا ہے۔

صوفی کا دوسرا عقیدہ

صوفی کل بنی نوعِ انسان کو ایک ہی جسم سے تعبیر کرتا ہے، جس کے مختلف اعضاء ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے نزدیک انسانیت یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کا دکھ درد محسوس کرے۔ انسانیت کو مذاہب، فرقوں، گروہوں اور قوموں وغیرہ میں تقسیم کرنا دینِ فطرت (اسلام) اور منشائے ایزدی کے خلاف ہے۔ احترامِ انسانیت کے سلسلہ میں صوفی، لوگوں کے رنگ و نسل، ادنیٰ و اعلیٰ، عقیدہ و نظریہ اور ملک و ملّت کے امتیازات و ترجیحات کو مصنوعی اور مضر جانتا ہے۔ بقول شیخ سعدیؒ وہ اس بات پر عقیدہ راسخ رکھتا ہے کہ :-

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو یک عضو درد آورد روزگار
ہمہ عضوہا را نماند قرار

"کل بنی آدم ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء ہیں، اس لیے کہ ان کی ابتداء

ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے۔ جس طرح جسم کے ایک حصّہ کی تکلیف سے سارا جسم بے قرار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سارے انسانوں کو بھی ایک دوسرے کی تکلیف کا احساس کرنا چاہیئے۔"

اسی عقیدے کے مطابق صوفی ہر عقیدہ ونظریہ کے مبلّغ کو پکار پکار کر یاد دلاتا رہتا ہے:-

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

"یعنی تمہارے وجود اور پیغام کی اصل غایت لوگوں میں رواداری، اتحاد اور محبت پیدا کرنا ہے۔ یاد رکھو! تم لوگوں میں نفاق وافتراق اور تعصب ونفرت پیدا کر کے انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے نہیں آئے ہو۔"

اس عقیدہ کے ساتھ ساتھ اہلِ حق اور صوفیائے کرام اس بات کا بھی شعور رکھتے آئے ہیں کہ ادیان کو سیاسی طور پر منظم کرنے سے خدا، پیغمبر اور کتاب کے نام پر ملاّ، پنڈت اور پادری کا عوام پر دوہرا تسلّط قائم ہوتا ہے۔ یہ بات ایک طرف تو مفادی گروہوں کو جنم اور تقویت دیتی ہے اور دوسری طرف اس سے انسانوں کی آزادی اور ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ صوفی کے نزدیک اسلام نئے نئے مفادی گروہوں اور لوگوں کے درمیان افتراق کی نئی دیواریں پیدا کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایسی ساری برائیوں کے خاتمہ اور انسانی اتحاد وسلامتی کو ترقی دینے کے لئے آیا ہے۔ وہ انسان کو خدا کا نائب تصوّر کرتا ہے اور مذہب، نسل، رنگ وغیرہ کے نام پر اس کی فطری آزادی کو سلب کرنے اور انھیں ایک دوسرے کا دشمن بنانے کو انسانوں کے بنیادی حقوق ومفادات کے خلاف جانتا ہے۔ دراصل صوفی ایک طرح کا فطرت پسند ہوتا ہے۔ اور ہر قسم کی جبری حدود وقیود سے بیزار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتنے ہی انتہاپسند صوفی، تارک الدنیا اور مجذوب ہو کر ملاّ کے دائرۂ تسلّط سے باہر

نکل جاتے ہیں۔

صوفی جملہ مذاہب کی ساری رسمی اور نمائشی باتوں کو غیر اہم اور بیسود سمجھ کر ان سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ وہ ان کی اصل روح اور غرض و غایت پر توجہ دیتا ہے اور ظاہری ڈھانچوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ عقل و عشق کو وہ ایک ہی تصویر کے دو رخ قرار دیتا ہے اور رہنمائی کے لیے وہ ان کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو فطرت کے ارتقائی عمل کا مظہر سمجھتا ہے۔ اور فرسودہ و بے سود باتوں کو ترک کر کے حالات اور ضرورت کے تقاضوں کے مطابق نئی چیز کا رواج پسند کرتا ہے۔ وہ فطرت کو رواں دواں، متحرک اور ہر گھڑی انقلاب پذیر دیکھتا ہے۔ اور اس سے مطابقت پیدا کرنے کو ضروری خیال کرتا ہے۔ وہ کسی بھی بات کو قدیم مقام پر ساکت و جامد محسوس نہیں کرتا۔ چاند، سورج، زمین، ستاروں اور سیاروں کو وہ ہر آن گردش میں پاتا ہے۔ موسموں کا تغیر اور ہوا و پانی کا تحرک اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ اس کی نگاہیں درختوں، جانوروں، اور آدمیوں کو جنم لینے، بڑھنے، پروان چڑھنے اور پھر فنا ہوتے ہوئے دیکھتی ہیں اور ان کی جگہ دوسروں کا وجود میں آنا بھی اسے اپنی جانب سے غافل نہیں ہونے دیتا۔ غرض سوائے ذاتِ الٰہی کے اسے کوئی چیز اپنی جگہ دائم و قائم دکھائی نہیں دیتی۔ تغیر و تبدل کے ان سارے لامتناہی سلسلوں پر نظر رکھنے والے سے آخر یہ توقع کس طرح رکھی جا سکتی ہے کہ وہ کسی ساکت و جامد نظام پر ایمان لے آئے۔ اور تحرک و ارتقاء کے تقاضوں کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ملا یا حکمران طبقہ کی جانب سے اسے اللہ، رسول اور قرآن کے نام پر بعض باتوں کے کرنے یا نہ کرنے کی ہدایات دی جاتی ہیں تو وہ اس کے مقصد کی تہہ تک جا پہنچتا ہے۔ وہ اس قسم کی ریاکارانہ ہدایات کو ان کے آمرانہ تسلط کے استحکام کا حیلہ جان کر ٹھکرا دیتا ہے۔ اور بغاوت پر کمربستہ ہے۔

وہ حق کو سورج کی روشنی یا ہوا کی لہروں کی طرح ہر ایک کی دسترس کے دائرہ میں تصور کرتا ہے اور اس پر کسی خاص گروہ۔ فرقہ یا قوم کی اجارہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے بنیادی اصول فنا و بقا کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ اور وہ ہر عمر رسیدہ چیز، عقیدہ اور دستور کو ختم جان کر ان کی جگہ نئے اور مفید تجربات کو بہتر سمجھتا ہے۔ وہ سازِ حیات سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے۔ اور اس بات پر پختہ اعتقاد رکھتا ہے

موجیم کہ آسودگی ما عدمِ ماست

ما زندہ بہ آنیم کہ آرام نہ گیرم

" زندگی موج کی مانند ہے۔ جس کا وجود تحرک سے ہوتا ہے۔ تحرک جاتا رہے تو وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔"

صوفی کا تیسرا عقیدہ

صوفی دین اور سیاست کو یکجا کرنا غلط سمجھتا ہے۔ اس کی نگاہ میں دین رضا کارانہ تجربہ اور علم و وجدان کی بنیاد پر حاصل کئے ہوئے تصورات کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ جس کو اپنانا یا اس کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنا ہر شخص کا اپنا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ جب ہر شخص علیحدہ پیدا ہوتا ہے اور علیحدہ مرتا ہے اور اپنے عقائد و اعمال کا خود ہی ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے تو دوسروں کو یہ حق کس طرح پہونچتا ہے کہ وہ ان باتوں میں دست اندازی کریں۔ دباؤ یا قانون کے ذریعہ افراد کے عقیدہ، خیال اور رائے پر حکومت یا مذہبی گروہوں کی اثر اندازی کو صوفی بنیادی انسانی حقوق کے خلاف سمجھتا ہے۔ مذہبی عقائد و اعمال کو ترک یا اختیار کرنے کے سلسلہ میں صوفی ہر شخص کو اس کی عقل و فہم، پسند و خواہش اور عقل و تجربہ کے مطابق آزاد چھوڑنے کا حامی ہے۔ اور اس آیتِ کریمہ پر صدقِ دل سے اعتقاد رکھتا ہے " لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی "

"یعنی دین کے معاملہ میں جبر یا زبردستی نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ہدایت کا راستہ ضلالت سے الگ اور واضح ہے۔"

صوفی عدمِ تشدد پر بھروسہ رکھتا ہے، وہ سیاست، مذہب، خیال، عمل اور روزمرّہ کی زندگی کے ہر معاملہ میں عدمِ تشدد کے اصولوں پر عمل دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ آنحضرت صلعم کے اس قول پر پورا اعتماد رکھتا ہے کہ "اختلاف الرائے فی اُمتی رحمۃٌ" یعنی میرے پیروؤں میں اختلافِ رائے کو برداشت کرنا رحمت کا باعث ہوگا۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ نظریہ اور خیال کی رنگا رنگی زندگی کے حسن کو دوبالا کرتی ہے اور تنوع فکر حسنِ ازل کو مزید دلکش بناتی ہے۔ اس سے پریشان اور غضبناک ہونے کے بجائے صوفی اس سے لطف اندوز ہوتا ہے اور بیساختہ پکار اُٹھتا ہے۔

"مارڻ لاءِ مسڪين جي لڪين ناز ڪيو آهين نوان نوان!"

"یعنی محبوبِ حقیقی نے مجھے اپنا مزید فریفتہ بنانے کے لیے کتنے ہی نئے نئے ناز و انداز اختیار کیے ہیں۔"

جس طرح مختلف رنگ کے پھول باغ کی زینت کا سبب بنتے ہیں اسی طرح صوفی کثرتِ خیال کو وحدتِ حق کے مختلف خوشنما پہلوؤں سے تعبیر کرتا ہے بقول شاہ لطیف بھٹائی علیہ الرحمہ :-

هڪ قصر در لک، ڪوڙين منجهس ڪڙڪيون،
جيڏانهن ڪريان پرک، تيڏانهين سڄڻ سامهون.

"یعنی ایک محل میں لاکھوں دروازے اور کروڑوں کھڑکیاں ہیں لیکن اس کے باوجود میں جس طرف نگاہ اُٹھاتا ہوں محبوب کو سامنے پاتا ہوں۔"

وہ جملہ مذاہب کو عرفانِ حق کے متنوع رنگ جانتا ہے۔ جو اس کی نگاہ میں ظاہری کثرت کے باوجود بنیادی وحدت اور حسن کو نکھارتے ہیں وہ دنیا کے ہر مذہب ہر فرقے اور ہر نظریہ میں حق کا نور پاتا ہے۔ اور جو لوگ ان کے ظاہری اختلافات میں الجھ کر رہ جاتے ہیں ان کی فکر کو وہ رد قرار دیتے ہو کہہ اُٹھتا ہے۔

حسن جو حق جو ۾ سو، خامي پانئين خام،
اچي ٿيا اسلام، ڪفر ڪافر هاڻ ۾.

"یعنی جن کی فکر خام ہے وہ حسنِ الٰہی کے مختلف جلووں کو خام سمجھتے ہیں۔ وہ کفر و اسلام کے تفرقوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ دونوں ایک ہی شے کے دو مختلف پہلوؤں کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

صوفیوں اور سنتوں نے انھیں خیالات کی وجہ سے مختلف مذاہب کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی متعدد کوششیں کی ہیں۔ چند ایک کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:-

- شیخ بدرالدین سماوا نے ترکی میں اسلام اور عیسائیت کو ایک نقطہ پر اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔
- ہندوستان میں بھگت کبیر اور گرونانک کی جانب سے ہندومت اور اسلام کو ملانے کی جہد کی گئی۔
- راجہ رام موہن رائے نے ہندوستان میں عیسائیت اور ہندومت کو یکجا کرنا چاہا۔
- ہنگ سیو چیان کی جانب سے چین میں تاؤازم اور عیسائیت کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کی کاوش کی گئی۔
- شہنشاہ اکبر نے ہندوستان میں اسلام، ہندومت، جین دھرم، عیسائیت اور دینِ زرتشت میں ایک آہنگ پیدا کرنا چاہا۔
- داراشکوہ کی جانب سے ہندوستان کے جملہ مذاہب کی مشترکہ اقدار کو جمع کرنے کی سعی کی گئی۔
- سندھ میں شاہ عنایتؒ اور سچل سرمستؒ جیسے بزرگوں نے مذہبی تعصبات کے خلاف محاذ قائم کیے اور انسانی وحدت کا تصور عام کرنے کی کوشش کی۔

اس قسم کی کاوشیں اور بعض کسی نہ کسی پیمانے پر دنیا بھر میں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ اور یہ اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہیں کہ صوفی مسلک لوگ انسانیت دوست ہوتے ہیں۔ مذہبی تفرقہ اور تعصب ان کی نگاہوں میں معیوب ہوتا ہے اور وہ دین کے معاملہ میں جبر کے عقیدہ کو اور اس کی بنیاد پر مذہب اور ریاست کو ایک دوسرے کا معاون ہتھکنڈا بنانے کو غلط اور ناجائز سمجھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہوتے ہیں کہ ان دونوں چیزوں کو یکجا کرنے کے نتیجے ہمیشہ عامۃ الناس کے لئے انتہائی خراب ہوتے ہیں۔ مذہب و سیاست کی یکجائی تاریخ و تجربات کی روشنی میں اس قدر غلط ثابت ہو چکی ہے کہ آج دنیا کے بیشتر ہندو، بدھ، عیسائی اور اسلامی ممالک اسے ترک کر چکے ہیں اور دنیائے اسلام میں پاکستان ہی وہ بڑا ملک رہ گیا ہے جہاں مفاد پرست گروہ اور اس کے چندوں اور عطیات پر پلنے والے ملا اس نظریہ کی حمایت میں آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔

صوفی کا چوتھا عقیدہ

انسانی مساوات صوفی کا چوتھا اہم عقیدہ ہے۔ عقیدہ اور مذہب کی بنیاد پر لوگوں کے کسی گروہ کو ترجیحی حقوق و مفادات کا مستحق ٹھہرانا صوفی کے اس عقیدہ کے خلاف ہے۔ وہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات پر ایک رسمی گروہ کی اجارہ داری قبول کرکے ایک نمائشی جمعیت کو دوسروں سے علیحدہ مفادات رکھنے والی الگ قوم یا فرقہ بنانا پسند نہیں کرتا۔ ملاازم کے اس عقیدہ کو وہ خودساختہ اور روحِ اسلام کے منافی سمجھتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیاتِ کریمہ صوفی کے اس خیال کی تائید کرتی ہیں:۔

"ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" یعنی تم میں سے پرہیزگار اور اچھی عادات واخلاق والے لوگ خدا کو پسند ہیں۔

" والذین امنو واعملوا الصلحٰت سندخلھم جنت التجری من تحتھا

الا نہار خالدین فیہا۔" یعنی جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور عملِ صالح کرتے ہیں وہ دائمی خوشی اور نعمت کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ صوفی ہر راسخ العقیدہ اور صالح العمل شخص کو صحیح مسلمان سمجھتا ہے اور ہر ریاکار کو غیر مسلم تصوّر کرتا ہے چاہے ایسے لوگوں کا ظاہری عقیدہ اور مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی اصول کے مطابق وہ رسمی مسلمانوں کو ترجیحی یا خصوصی مفادات رکھنے والی ایک الگ مستقل قوم تصور کرنے کے خلاف ہے اور رسمی اسلام کے نام پر ایک مخصوص علاقہ میں مذہبی سیاسی نظام قائم کرنے کو غلط اور ریاکاری سمجھتا ہے۔

صوفی کا پانچواں عقیدہ

صوفی کفر اور اسلام کی تقسیم "رسمی اسلام اور رسمی انکارِ اسلام" کی بنیادوں پر نہیں کرتا بلکہ فکر و عمل کی اچھائیوں اور برائیوں کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ دینِ فطرت اور منشائے ایزدی کے مطابق اسلام اور کفر کی اقدار اس طرح ہیں:۔

اسلام	کفر
بے طمعی	خودغرضی
اتفاق	نفاق
محبت	نفرت
عدمِ تشدد	جبر
انسانیت	فرقہ پرستی

ان میں اسلام کی قدروں کے بارے میں صوفی کی تشریحات صفحاتِ گذشتہ میں کی جا چکی ہیں چنانچہ یہاں میں اقدارِ کفر کے بارے میں اس کے تصورات کی مختصر تشریحات پیش کروں گا۔

خودغرضی :- صوفی کے نزدیک ہر وہ فکر و عمل جو چند افراد یا کسی ایک گروہ

کو ترجیحی حقوق و مفادات کا حقدار ٹھہراتا ہو اور عوام کے حقوق و مفادات سلب کرتا ہو، خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے، ہر وہ بات جو محض ایک فرقہ کو فائدہ اور انسانیت کو نقصان پہنچاتی ہو خود غرضی ہے، ہر وہ عمل جو کسی ایک عقیدہ کی برتری تسلیم کرانے کے لئے دباؤ کی صورت اختیار کرتا ہو صوفی کے نزدیک خود غرضی کا مظہر ہے، اسی طرح ہر وہ بات جو کسی ایک ملک کو فائدہ پہنچانے کے لئے دوسرے ملک کو نقصان پہنچاتی ہو اس کی نظر میں خود غرضی کے سوا کچھ نہیں اور وہ ایسی ساری خود غرضیوں کو عین کفر تصور کرتا ہے۔

نفاق :- صوفی کے عقیدہ کے مطابق حقیقی وجود صرف ذات واحد ہے۔ چنانچہ کثرت کو حقیقت جاننا اور ان کی تفریق کرنا غلط ہے۔ اس تصور کی بنا پر وہ لوگوں کے اس رجحان کو کفر سمجھتا ہے کہ عقیدہ و مذہب کی ظاہر داریوں کی بنیاد پر وہ کسی کو جلیل و ذلیل یا جنتی دوزخی ٹھہرائیں۔ یا امتیازی سلوک کا مستحق گردانیں۔ اس سے نفاق پیدا ہوتا ہے جو عناد و فساد کا سبب بنتا ہے۔

اسلام کلی طور پر امن و سلامتی کا پیغام ہے چنانچہ جو بات بھی افراد گروہوں اور ملکوں کے مابین نفاق پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے صوفی اسے اسلام کے خلاف اور کفر سمجھتا ہے۔ چاہے ایسی کوئی بات ریاکارانہ طور پر قرآن وحدیث اور شریعت اسلام ہی کے نام سے کیوں نہ پیش کی جائے۔

نفرت :- صوفی محبت کا دلدادہ ہے اور اسی کو مقصد حیات قرار دیتا ہے اور نفرت کو اس کی ضد سمجھتا ہے۔ چنانچہ ہر وہ بات جو افراد۔ جمعیتوں۔ مذہبوں۔ فرقوں۔ قوموں اور ملکوں کے مابین نفرت پیدا کرتی ہو۔ چاہے وہ اسلام۔ خدا۔ رسول یا اور کسی دوسرے اچھے نظریہ اور عقیدہ کے نام پر ہی کیوں نہ کی جائے صوفی کی نظر میں صریحاً کفر ہے۔

جہاں محبت ہوگی وہاں نفرت کیلئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ صوفی دنیا کی ساری برائیوں کی جڑ نفرت کو سمجھتا ہے۔ یہ نفرت ہی انسان کو انسان کا دشمن بناتی اور

جنگ و فساد برپا کرتی ہے۔ چنانچہ صوفی کی نظر میں محبت ۔ دینِ فطرت ۔ قانونِ ارتقار اور اسلام بالکل ایک ہیں اور نفرت ۔ ریاکاری ۔ رجعت پسندی اور کفر بالکل ہم معنی ہیں ۔ اسی لیے جب وہ اسلام کے نام پر اقتدار پسند طبقہ یا اس کے حواری ملاؤں کو نفرت پھیلاتے دیکھتا ہے تو بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے ۔

محبت سندي مام، ڪور پروڙي ڪين ڪي.

" یعنی مفاد پرستی نے انھیں کور باطن بنا دیا ہے وہ محبّت کے راز اور اس کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتے ۔"

جبر و تشدّد :- صوفی ہر قسم کی جارحیت' زبردستی ' دباؤ اور تشدّد کے خلاف ہے ۔ اور اسے عشق و محبّت اور انسانیت کے تقاضوں کے برعکس قرار دیتا ہے ۔ چاہے کسی قسم کا جارحانہ تشدّد خدا ۔ رسول ۔ اسلام ۔ ملک اور قوم ہی کے نام پر کیوں نہ کیا جائے ۔ اس کے برعکس وہ رواداری کا حامی ہے ۔ اور ایسا معاشرہ پسند کرتا ہے جس میں :-

- دولت و غربت کے امتیازات نہ ہوں ۔
- حاکم و محکوم کی حیثیت و مفادات میں فرق نہ ہو ۔
- مذہب ۔ رنگ اور نسل کی بنا پر کسی کو کوئی تفوق حاصل نہ ہو ۔
- ذاتی عقائد کے بارے میں ہر شخص آزاد ہو ۔
- متضاد مفادات رکھنے والے مستقل طبقات کا کوئی وجود نہ ہو ۔

صوفی اجتماعی نظام کے انتخاب کے لئے باہمی مشورت اور رضامندی کو بنیاد ٹھہراتا ہے اور کل بنی نوع انسان کو ایک واحد اور پسندیدہ معاشرہ میں منظم کرنا چاہتا ہے ۔ مذاہب اور نظریات کے اختلافات کو وہ بنیادی وحدت کے زاویہ سے دیکھتا ہے ۔ اور اس سلسلے میں رواداری اور بقائے باہمی کے اصولوں کو اپنانا ضروری خیال کرتا ہے ۔ مجموعی طور پر وہ "لکم دینکم ولی دین" کا عملی نفاذ چاہتا ہے ۔

باب پنجم

تصوّف ۔ جیسا کہ میں نے سمجھا

تصوف کا لفظ مسلمانوں میں ایک مدّت سے رائج ہے ۔ لیکن یہ لفظ جن خصوصی عقائد و مقاصد کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ ان کو دیگر مذاہب کے سادھوؤں۔ سنتوں ۔ راہبوں اور بھکشاؤں نے بھی مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ مختلف ادوار میں دنیا کے جن مفکر گروہوں نے اس مسلک کی تعلیم و تشریح میں حصّہ لیا ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل نمایاں ہیں :۔

۱۔ افلاطون (فلسفہ اعیان) نوفلاطونی مفکرین ۔ اسپنوزا اور بعض دیگر فلسوف۔

۲۔ ویدانتی رِشی اور سنت ۔

۳۔ توحید پسند عیسائی ۔ راہب اور اسٹائکس ۔ Stoics ۔

۴۔ بدھ دھرم کے بعض بھکشو ۔

۵۔ جین مت کے کچھ یوگی ۔

۶۔ مسلمان وحدت الوجودی صوفیائے کرام ۔

۷۔ تھیوسافسٹ Theosophist

۸۔ جدید مذہب انسانیت کے حامی Modern Humanists ۔

۹۔ اس نوع کی مختلف روحانی جماعتیں اور افراد۔

مسلمان مفکرین میں سے متعدد نے تصوف کو فلسفۂ اسلام، روحِ اسلام، مذہبِ عشق، مسلکِ تزکیۂ نفس اور فکرِ خود آشنائی وغیرہ کے نام دیئے ہیں اور بعض حق شناس درویشوں نے تو خود اسلام کو عین تصوف جانا ہے۔ اس طرح دیگر مذاہب کے اہلِ نظر بزرگوں نے بھی اس کی توصیف کی ہے اور اسے اپنایا ہے۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس طرح جملہ مذاہب اپنے پیروؤں کی خامیوں کی وجہ سے اپنی اصل غایت و تعلیمات کو پسِ پشت ڈال کر نمائشی عقاید و روایات کا مجموعہ اور ذاتی و گروہی مفادات کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں۔ بالکل یہی حال صوفی تحریک کا بھی ہوا ہے۔

جس طرح ملّا والے اسلام کے پیرو نمازیں پڑھنے۔ روزہ رکھنے۔ زکوٰۃ دینے۔ حج کرنے۔ میلاد و مجالس کرانے اور مساجد و امام باڑے بنوانے وغیرہ ہی کو دین کے اصل تقاضے سمجھ کر ہر طرح کی بدعنوانیوں۔ دھاندلیوں۔ ضمیر فروشیوں۔ بے انصافیوں اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ ذاتی مفاد و آسائش حاصل کرنے سے نہیں چوکتے۔ یا جس طرح مذہب کے نام نہاد ٹھیکہ دار، زمیندار و سرمایہ دار طبقہ کے استحصالی مفادات کے تحفظ کی خاطر، مذہب کو غلط طور پر استعمال کرنے، اختلافِ رائے کرنے اور اتفاق نہ کرنے والوں کے خلاف نفرت اشتعال اور دہشت گردی پھیلانے ہی کو اپنا دینی شعار قرار دے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح رسمی تصوف کے پیرانِ طریقت کی اکثریت بھی اپنے ذاتی مفادات اور نمائشی روحانی اقتدار کی خاطر مختلف گروہوں میں بٹ کر مفاد پرست اقتدار پسندوں سے گٹھ جوڑ کر کے ان کی آلۂ کار بن گئی ہے اور عوام کو عمل و شعور سے بیگانہ رکھنے کے لیے توکل۔ قناعت اور جبر مشیت وغیرہ کی غلط تعلیمات نیز ورد و وظائف اور تعویز گنڈوں کی کراماتی دکانیں سجا کر بیٹھ گئی ہے۔

ہمارے ملک کا تعلیمیافتہ اور نوجوان طبقہ جس طرح ملاازم کے روپ میں ہونے والے
اسلام کے استعمالِ غرضی Exploitation سے تنگ آکر مذہب سے بیزار ہوتا جارہا
ہے۔ اسی طرح وہ صوفی ازم کے نام پر کی جانے والی گھٹیا باتوں مثلاً پیر پرستی کرامتوں
کی ڈھونگ بازی، حسن پرستی کے نام پر بداخلاقی، ترکِ دنیا کے نام پر کاہلی و
بے عملی، خودشناسی کے بغیر ہی انا الحق کی رسمی نعرہ زنی اور نشہ بازی وغیرہ وغیرہ
سے متنفر ہو کر اس مسلک کو بھی حقارت سے دیکھنے لگا ہے۔

جیسا کہ قارئین کی نظر سے گزر چکا ہے میں نے اس کتاب کے پیشِ لفظ میں
اور اس کے بعد کے دیگر ابواب میں اس مسلک کے اصل پہلوؤں کی نشاندہی کی
ہے۔ اس سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ میں نے نوعِ انسانی کے مجموعی
مفاد کی خاطر تین بنیادی مقاصد پر زور دیا ہے یعنی اتحادِ انسانی۔ امنِ عالم اور ترقی
بنی آدم۔

ان عظیم مقاصد کے لیے کام کرنے والے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے لوگوں کو
دعوتِ اتحاد دینے کے لئے کس نام کا مسلک سب سے زیادہ موزوں رہے گا ؟
میں نے اس پر کافی غور کیا ہے۔ بلاشبہ حقیقی اسلام کی تشریح اس سلسلہ میں
میرے لیے کافی تھی۔ مگر چونکہ بحیثیت ایک منظم اور مخصوص دین کے یہ نام روایتی
عقائد و رسوم کا مظہر مشہور ہو چکا ہے اور اس کے پیرو دیگر مذاہب کے پیروں
کی طرح بعض مستقل مفادات و خصوصیات کے داعی سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے اس
بات کا واضح امکان تھا کہ روایتی تعصب و نفرت کی بنا پر دیگر
مذاہب کے لوگ میری تشریح کے باوجود اس نام سے شکوک و شبہات میں مبتلا
ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے تصوّف کا نام منتخب کیا ہے۔ جو اس کے بعض
داعیوں کی غلط کاریوں کے باوجود بے تعصبی اور رواداری کے اصولوں کا
مظہر اور مبلّغ ہے اور بہرحال بین الاقوامی کشش اور تعارف رکھتا ہے ویسے
بقول بیدل فقرہ

اَ کمران دي وچ جڙتي اڙيا،
عشق دي چاڙهي مو ر نه چڙهيا.

مجھے کسی خاص نام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن چونکہ اس عالم زمان و مکان میں کسی علامتی لفظ کے بغیر کسی مفہوم کی ادائیگی دشوار ہوتی ہے۔ اس لیے میں اپنے بیان کردہ مقاصد کو متعین کرنے کے لیے "تصوف" کو جسے جدید محاورے میں مذہب انسانیت کہا جاتا ہے، زیادہ بہتر اور موزوں تصور کرتا ہوں۔

مجھے اس کلیہ سے اتفاق ہے کہ ہر شخص جو بھی بات بیان کرتا ہے وہ اس کے طبعی رجحان اور اس کی خوبیوں و خرابیوں سے خالی نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں نے جو کچھ بھی قارئین کے سامنے پیش کیا ہے یا آئندہ سطور میں پیش کروں گا اس میں بھی یہ دونوں ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ بہرحال صوفی ازم کے بارے میں اپنی تشریحات پیش کرنے میں میری یہ کوشش ضرور رہے گی کہ اس سلسلہ میں سرزمین سندھ کے بزرگوں کے رجحانات اور اس خطہ کی تین ہزار سالہ تاریخ کے کردار کی حتی الامکان صحیح ترجمانی ہو سکے۔

میری نظر میں تصوف کی بنیادیں مندرجہ ذیل اعلیٰ اصول و مقاصد پر استوار ہو سکتی ہیں:-

۱۔ نظریۂ وحدت الوجود (ویدانت) جس کے تحت کائنات کی اصل حقیقت صرف ذاتِ الٰہی ہے۔ اور اس میں نظر آنے والی جملہ اشیاء اس کی صفات یا تجلّی کے مختلف مظاہر ہیں۔ لیکن یہ تصور بڑی احتیاط کا طالب ہے۔ اس میں انتہا پسندی سے کام لینے کی وجہ سے کئی غلط نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر عملی زندگی کو فریب نگاہ قرار دے دیا جائے تو کتنے ہی لوگ تارک الدنیا ہو جائیں گے اور رہبانیت اختیار کر لیں گے۔ اور رہبانیت اختیار کر لیں گے۔ افراد و معاشرہ کا یہ انحطاط دینِ فطرت اور قانونِ ارتقاء کے بھی یکسر خلاف ہے اور اس منشائے ایزدی کے بھی برعکس ہے۔ جس کے تحت اس نے کائنات تخلیق کی اور حرکت و عمل کو اس کا "نظام" ٹھہرایا۔ منشائے تخلیق کیا ہے؟
اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے ایک سندھی درویش نے فرمایا ہے ؎

حرکت و عمل کو اس کا "نظام" ٹھہرایا۔ منشائے تخلیق کیا ہے؟ اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے ایک سندھی درویش نے فرمایا ہے ؎

جڏاں عشق دل وچ نہ مایس، ہو ھن فقیر دا چا پابس،
دلیان لـ:ـاون دي کيني، چاڪ لقب چا لایا۔

" یعنی جب اس ذاتِ حقیقی میں خود اپنے وجود کے اظہار کا شوق پیدا ہوا تو اس نے کائنات اور انسان کے بہروپ میں ظاہر ہو کر دل لگانے کا شغل اختیار کیا۔"

گویا زندگی سے دل لگانا ہی منشائے ایزدی ہے۔ عدم کو مسجد و کعبہ اور وجود (زندگی) کو میخانہ سے تشبیہ دیتے ہو حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ اسی منشائے ایزدی کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

" یعنی میرا مرشد (خالقِ حقیقی) مسجد سے اٹھ کر میخانہ میں آ بیٹھا ہے۔ اے یارانِ طریقت ایسی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

یہ سوال کر کے حافظ خود ہی جواب دیتے ہیں ؎

ما مریداں رو بہ سوئے کعبہ چوں آریم چوں
رو بسوئے خانۂ خمار دارد پیر ما

" یعنی ہم عقیدت مندوں کے لیے کعبہ میں رکھا ہی کیا ہے، جبکہ ہمارا آقا خانۂ خمار میں جلوہ افروز ہے۔"

غرض جب منشائے تخلیقِ کائنات خانۂ خمار یعنی دنیا اور اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے۔ تو پھر ایسی صورت میں اپنا صحیح کردار انجام دینا ہی رضائے الٰہی کے مطابق ہو سکتا ہے چنانچہ زندگی کی تگ و دو سے منہ موڑ کر بیکار بن جانا مقاصدِ زندگی سے ناواقفی یا دیدۂ و دانستہ انحرافی کے علاوہ کچھ نہ ہو گا۔

دوسرا اہم اندیشہ اس تصور کی انتہا پسندی سے یہ برآمد ہو سکتا ہے کہ

خیر و شر، نیک و بد اور ظالم و مظلوم کو واحد تصور کر کے اُن کے امتیازات ختم کر دیئے جائیں۔ یہ بات معاشرہ کے لیے انتہائی تباہ کن ہوگی۔ قانونِ فطرت اور مقاصدِ زندگی ایسے رجحان کی یکسر نفی کرتے ہیں۔ قانونِ ارتقاء کے تقاضہ کے مطابق ہر جزو کو کل سے آہنگ پیدا کرنے کی جدّوجہد کرنی ہے اور جب زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کی طور پر اتحادِ انسانی، امنِ عالم اور ترقی بنی آدم ٹھہرتے ہیں تو اس کے لیے صحیح علم، اصلاحِ نفس اور اخلاقِ حمیدہ کو فضیلت دینا لازمی ہو جاتا ہے شاہ بابو رحمۃ اللہ اس نکتہ کی وضاحت میں فرماتے ہیں ؎

علمي باجهون كوني فقر كماوي كافر مري ديوانه هو-
سو ورهيان دي كري عبادت رهي الله كنون بيگانه هو-
غفلت كنون نه كلسن پردي دل جاهل بت خانه هو-

" یعنی علمِ صحیح کے بغیر اگر کوئی مسلکِ درویشی اختیار کرتا ہے تو یا تو کافر ہو جاتا ہے یا دیوانہ۔ ایسا شخص اگر سو سال بھی عبادت کرتا رہے تو اللہ کو نہ پہچانے گا۔ غفلت کی وجہ سے اس کی نگاہوں پر پڑے ہوئے پردے دور نہ ہوں گے۔ اور اس کا دل جہل کا بت خانہ ہی رہے گا۔"

۲۔ تصوّف کا دوسرا درویشی اصول یہ ہے کہ ذاتِ حقیقی کو قیاس و گمان اور وہم سے بالاتر تصوّر کیا جائے۔ اس اصول پر ایمان لانے کی وجہ سے خدا کے شخصی اور غیر شخصی تصوّر سے نجات مل جاتی ہے۔ شخصی تصوّر بت پرستی کا باعث ہوتا ہے۔ اور غیر شخصی تصوّر خدا کے شریک ٹھہرانے کا۔

۳۔ کائنات کی پیدائش میں منصوبہ Plan اور اس کے نظام میں باقاعدگی کا مطالعہ تصوّف کا تیسرا اہم اصول ہے۔ اس کے بغیر مسلکِ تصوّف خام رہ جاتا ہے۔ اگر دنیا کے حالات و کاروبار پر سطحی نگاہ ڈالی جائے گی تو اس میں ہمیں شدید بے ڈھنگی اور بے ترتیبی نظر آئے گی۔ مثال کے طور پر :-

٥ سخت محنت و مشقت کے باوجود دنیا کے کروڑوں افراد ضروری خوراک،

لباس، رہائش، علاج اور تعلیم سے محروم رہتے ہیں اور مٹھی بھر افراد بغیر کسی خاص کاوش کے عیش و آرام کی زندگی گزارتے ہیں۔

٥ کچھ لوگ تندرست پیدا ہوتے ہیں اور عمرِ طبعی کو پہنچ کر ہی فوت ہوتے ہیں، مگر کتنے ہی افراد پیدائشی طور پر جسمانی یا ذہنی امراض میں گرفتار ہوتے ہیں، اہم اعضاء سے محروم ہو جاتے ہیں، حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں یا مصائب اور محرومیوں کی وجہ سے عمرِ طبعی سے محروم رہتے ہیں۔

٥ ایک جانب تہذیب و تمدّن اور اخلاق و شائستگی کے دعوے کیے جاتے ہیں اور دوسری جانب ہولناک وحشیانہ جنگیں چھیڑ دی جاتی ہیں جن میں کروڑوں افراد کی زندگی اور ان کی بے حساب محنت، وقت اور دولت کے ذریعہ تعمیر کردہ تمدّن کی کتنی ہی نشانیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ ایسے موقعے پر نہ کوئی دنیاوی طاقت ہی فریقین کے آڑے آتی ہے نہ ہی خدا کی جانب سے انھیں کوئی ہدایت پہنچتی ہے۔

٥ کچھ لوگ خوبصورت ہوتے ہیں تو کتنے ہی بدصورت۔ بعضوں کو عقل کی دولت ملتی ہے تو کتنے ہی فہم و شعور سے کورے ہوتے ہیں، کچھ لوگ رحمدل اور انسانیت دوست ہوتے ہیں تو کتنے ہی شقی القلب اور انسانیت دشمن۔

انسانی زندگی میں اس قسم کی متضاد کیفیتوں کو دیکھ کر بعض لوگ یہ سوچنے لگ جاتے ہیں کہ اگر کائنات فی الواقعہ کسی منصوبہ Plan کے تحت وجود میں آئی ہوتی اور اس کا نظام، توازن و عدل کی بنیادوں پر جاری ہوتا تو دنیا میں اتنی افراتفری کیوں پھی ہوتی ؟

دوسری جانب جب مظاہرِ فطرت کی حرکات پر غور کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ سارے ستارے اور سیارے جن میں خود ہماری زمین بھی شامل ہے اپنے اپنے خاص دائرہ، راہ اور رفتار پر باضابطگی سے گردش کرتے رہتے ہیں، دن، رات اور موسم اپنے قاعدہ کے مطابق آتے جاتے رہتے ہیں جاندار پیدا ہوتے ہیں، وہ اپنی

اوسطِ عمر طے کر کے فنا ہو جاتے ہیں۔ سمندر سے پانی بھاپ بن کر اُٹھتا ہے۔ برف کا روپ اختیار کرتا ہے اور پھر پانی بن جاتا ہے۔ بارشوں اور دریاؤں کی شکل میں زمینوں کو سیراب کرتا ہے اور پھر سمندر میں جا شامل ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دنیا اور کائنات میں پائی جانے والی ضابطگی اور بے ضابطگی کی ان دونوں صورتوں کے پیشِ نظر اس کے بارے میں دو طرح کے نظریات قائم کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ باوجود دیکہ کائنات میں منفی اور مثبت (خیر و شر) طاقتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں پھر بھی کائنات کی تخلیق منصوبے سے اور اس کا نظام مقصدیت سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ یہ سارے معاملات اتفاقیہ ہیں اور حادثات Accidents کی بنیادوں پر جاری ہیں۔ یہی نظریہ دہریت کے فلسفہ کی پیداوار ہے۔

وحدت الوجود (ویدانت) پر ایمان رکھنے والے صوفیا نے اس پر غور کیا ہے لیکن انھوں نے ان دونوں نظریات سے کلی اتفاق نہیں کیا ہے۔ یعنی انھوں نے تخلیقِ کائنات میں منصوبہ کا بھی اعتراف کیا ہے اور قانونِ ارتقا کو اس کی اساس مانتے ہوئے اسے خیرِ کل بھی قرار دیا ہے۔ ان میں سے بعض نے دنیا میں پائی جانے والی مذکورہ بالا بے ضابطگی کو اسرارِ الٰہی سمجھ کر ٹال دیا ہے۔ لیکن بعض نے انھیں عارضی اور قانونِ فطرت کی مائل بہ تعمیر کشمکش کا مظہر سمجھا ہے، اور مستقبل میں ان برائیوں کے خاتمہ پر اعتقاد رکھا ہے۔

لیکن اس سارے معاملہ میں یہ ایک بات صاف طور پر جھلکتی ہے کہ فطرت کی بے ضابطگیوں اور انسانی مصائب کے بارے میں پیدا ہونے والی منفی رائے کا اہم ترین سبب خدا کا شخصی تصور ہے۔ جس کے مطابق دنیا کا ہر واقعہ خدا کی مرضی یعنی رضامندی اور ناراضگی کے سبب ظہور پذیر ہوتا ہے۔ خدا کا یہی شخصی تصور آگے بڑھ کر جنت دوزخ، کرامات، معجزات، اور خرقِ عادات وغیرہ کے ایسے عقائد کو جنم دیتا ہے جس کے تحت بعض افراد کو مرضیٔ خدا میں دخیل قرار دیکر اس کے فیصلے تبدیل

کرانے کا اہل تصوّر کر لیا جاتا ہے اور یوں اس کے عدل وانصاف کو کھیل بنا لیا جاتا ہے۔ صوفی چونکہ خدا کے ایسے شخصی تصوّر پر اعتماد نہیں رکھتا اس لئے وہ ایسی ساری باتوں کو حقیقت کے خلاف سمجھتا ہے۔

۴۔ کل نوعِ انسانی کو ایک جسم واحد تصوّر کرنا تصوّف کا چوتھا اہم اصول ہے۔ اسی اصول کے مطابق صوفی سارے انسانوں کو ان کی طبیعتوں، زبانوں، ثقافتوں، رنگوں، نسلوں، مذہبوں اور نظریوں کے اختلافات کے باوجود ایک جیسے انسانی سلوک و حقوق کا مستحق سمجھتا ہے۔ اور ان کے اتحاد، امن اور ترقی کی راہ میں حائل ہونے والی کسی بات کو بہتر نہیں تصور کرتا۔

صوفی عشق کی ایسی بلندی پر فائز ہوتا ہے کہ اُسے ظاہری عقاید کے امتیازات ایک ہی سطح پر محسوس ہوتے ہیں۔ اور جس طرح اونچائی پر اُڑنے والے ہوائی جہاز سے فرشِ زمین کی ساری پستیاں اور بلندی، دریا و جنگلات اور ریگزار و گلزار ایک قالین کے نقش و نگار کی طرح نظر آتے ہیں۔ اسی طرح صوفی کی نگاہ میں بھی نوعِ انسان کے مابین موجود جملہ نمائشی اختلافات و امتیازات کی حیثیت ایک ہی کل کے مختلف اجزاء کی سی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی خواہش و کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ یگانگت، محبّت اور یکجہتی پیدا ہو۔

۵۔ تصوّف کا پانچواں اہم اصول "وحدتِ مذاہب" ہے۔ نوعِ انسانی کی وحدت پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ صوفی مختلف مذاہب کے پسِ منظر میں غایت کی وحدت بھی دیکھتا ہے۔ ظاہری کفر و اسلام کو وہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں تصور کرتا ہے۔ اس بارے میں اس کا عقیدہ ملّاازم سے قطعی مختلف ہے۔ ملّا دوسرے فرقوں اور مذاہب کے پیروؤں کو کافر قرار دیتا ہے، لیکن صوفی جملہ مذاہب کو ایک جیسا سمجھتا ہے۔ اور دہریت کو ان سے مختلف جانتا ہے۔ لیکن پھر دہریت اور مذاہب کو بھی ایک ہی تصویر کے دو رُخ شمار کرتا ہے یعنی مذاہب کو وہ ارتقاء کا پیغامبر اور دہریت کو انقلاب کا نقیب قرار دیتا ہے۔ وہ دونوں کی اصل منزل

ایک ہی تصور کرتا ہے۔ البتہ ان کے طریقۂ کار میں اختلاف سمجھتا ہے۔

۶۔ علم و عشق کو مذہب کی اصل روح تصور کرنا تصوف کا چھٹا اہم اصول ہے۔ صوفی کے نزدیک عشق افراد کے مابین قربت و اتحاد کا سبب بن کر عالمی امن کی فضا کو سازگار بناتا ہے اور علم انسان کو ترقی کی راہ دکھاتا ہے۔ علم و عشق ہی کے ذریعہ نفرت و نفاق، فرقہ پرستی و تعصب اور خود غرضی و خود پسندی کی وہ رکاوٹیں دور کی جا سکتی ہیں جو نوعِ انسانی کے اتحاد، امن اور ترقی کی راہ میں اڑے آتی ہیں۔

۷۔ تصوف کا ساتواں اصول ثقافت یا کلچر (Culture) کا احترام ہے۔ صوفی صاحبِ دل ہوتا ہے۔ وہ دل و دماغ کی آبیاری کے ذریعہ انسان کو مہذب اور شائستہ بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ جدید لفظ کلچر یا ثقافت کے دائرۂ مفہوم میں جو باتیں بھی آجاتی ہیں وہ ان سب کو پسند کرتا ہے۔ وہ طہارتِ نفس اور جذبۂ تعمیر کا حامی ہے۔ ہر وہ شغل و عمل جو لوگوں میں بے حسی، پژمردگی اور یاسیت کو ختم کرتا ہو مجموعی مفاد کے لیے کام کرنے پر ابھارتا ہو، محبت اور جفاکشی کے عزائم بخشتا ہو، صوفی کی نظر میں داخلِ اخلاق ہوتا ہے۔

○ تصوف کے ان جملہ اصولوں سے مطابقت رکھنے والے مقاصد کے حصول کے لیے زندگی کو وقف کر دینا صوفی اپنا مقصدِ حیات ٹھہراتا ہے۔ اور اپنی بات منوانے کے لیے صرف دل و دماغ میں گھر کرنے والے طریقے اختیار کرنا پسند کرتا ہے۔

○ صوفی کا دائرۂ کار مخصوص ہوتا ہے۔ نہ وہ کسی دین و عقیدہ کا دشمن ہے نہ کسی کا جانب دار۔ وہ بقائے باہمی Co-existence کا حامی ہے۔ وہ مذہب، رنگ، نسل یا نظریات کے نام پر انسانوں کے درمیان کھڑی کی ہوئی نفرت کی دیواروں کو گرانے کے حق میں ہے۔ اور ہر اس بات کا مخالف ہے جس سے افراد اور گروہوں، اور قوموں اور ملکوں کے درمیان منافرت پھیلتی ہو، چاہے اس قسم کی باتیں خدا پیغمبروں، الہامی کتابوں اور کسی نظریہ کے

وقار ہی کے نام پر کیوں نہ کی جائیں۔

○ صوفی کی نظر میں انسانی معاشرہ ارتقار کے اس درجہ پر آچکا ہے کہ جس میں ملکی معاملات، معاشی نظام، نظم وضبط اور عدل وانصاف کے جملہ ادارے سب جمہوری حکومتوں کے تابع ہونا چاہئیں۔ اور ان معاملات میں مخصوص مذہبی گروہوں یا کسی ایک خاص اور مفاد پرست طبقہ کو اجارہ داری یا دخل اندازی کا حق نہ ہونا چاہیئے۔

○ اقتدار پسند مفادی گروہ اور اس کے چندوں اور عطیات پر پرورش پانے والے ملّا عوام کو دھوکہ دینے کے لیئے اس سلسلہ میں چاہے جو کچھ بھی کہیں، لیکن صوفی کا ذہن صاف ہے وہ جملہ مذاہب کو ایک وفاقی وحدت میں دیکھنا چاہتا ہے۔

○ صوفی عقیدہ وخیال کی آزادی کا حامی ہے اور اسے وہ ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ اس بارے میں وہ جماعت یا حکومت کی دست اندازی اور جبر کو قطعی ناجائز تصور کرتا ہے نہ وہ خود دوسروں کے عقیدہ اور رائے پر بزور اثر انداز ہونا چاہتا ہے نہ دوسروں ہی کو اپنے یا ایک دوسرے کے خیالات پر اثر انداز ہونے کے لئے دباؤ کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔

○ صوفی عدمِ تشدّد یا اہنسا کا حامی ہے۔ اپنے عقائد کے اظہار وتبلیغ کیلیئے وہ شائستہ اور دلپسند طریقے اختیار کرتاہے وہ جبر، لالچ، گمراہ کن پروپیگنڈا اور اوچھے ہتھکنڈوں کو خلوص اور نیک نیتی کے برعکس سمجھتاہے۔ وہ مذہبی جہاد اور خونی انقلاب کے نظریات کا مخالف ہے۔ وہ اصلاحِ نفس کی جد وجہد کو ہی جہادِ اکبر سمجھتا ہے۔

○ صوفی خودی (خودغرضی وخود پرستی) کے خلاف ہے اور اُسے نفس امارہ کی پیداوار جان کر اُس سے نجات حاصل کرنا ضروری جانتا ہے۔ اس بارے میں اُسے کوئی شک وشبہ نہیں کہ:-

خودی، دوئی کے تصور کو جنم دیتی ہے۔

خودی تشدّد کے رُجحان کو اُبھار کر سامراجیت اور سرمایہ داری کے نظریہ

کو تقویت پہنچاتی ہے۔

خودی نفاق و نفرت پیدا کرکے بدامنی کا باعث بنتی ہے۔

خودی اونچ نیچ، اعلیٰ وادنیٰ اور برتر و کمتر کے تصوّرات پیدا کرکے عدم مساوات کے رُجحانات کی جڑیں مضبوط کرتی ہے۔

چنانچہ صوفی اس بارے میں اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ عشق و خودی دونوں ایک ہی دل میں یکجا نہیں ہو سکتے۔

○ صوفی رقص و موسیقی، شعر و ادب اور ہر اس چیز کو جو انسانی کلچر، ثقافت کو زرخیز بناتی ہے۔ اور انسانی جسم و ذہن کو تازہ دم کرتی ہے اور انسان کو عمل، انبساط و دنیا کے احترام کے جذبہ سے سرشار کرتی ہے۔ جائز قرار دیتا ہے۔

○ صوفی فسطائیت کے نظریہ کو غلط اور نقصان دہ تصوّر کرتا ہے، چاہے وہ مذہب، روحانیت، سیاست، اور علم وغیرہ کے خوشنما غلافوں ہی میں کیوں نہ لپیٹ کر پیش کیا جائے۔

○ صوفی خودی کو ختم کرنے کا حامی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں لیتا کہ وہ سست، بیکار اور تارک الدنیا ہو جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ افراد کو ملک و قوم کے لئے قربانی دینے کی تلقین کرتا ہے اور قوم و اقوام کو کل بنی نوعِ انسان کے مفاد کے لئے کام کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ "تنازعہ للبقا" اور ترقیٔ اسلحہ کے رُجحانات کے بجائے "تعاون برائے ترقی" کے نظریہ کا مبلّغ ہے۔

○ صوفی حق و صداقت پر کسی مخصوص گروہ کی اجارہ داری تصوّر نہیں کرتا۔ وہ "لاکونی" Non-aligned ہے۔ کسی بھی مذہبی، اقتصادی اور سیاسی نظریات، نظریہ کو حرفِ آخر جان کر اُس کی اندھی تقلید کرنے سے گریز کرتا ہے۔ وہ نظریات کو انسانوں کے پیدا کردہ سمجھتا ہے۔ انسانوں کو نظریات کا پیدا کردہ نہیں خیال کرتا۔ وہ صرف اچھی اور کارآمد باتیں قبول کرتا ہے اور بری یا ناکارہ باتوں سے پرہیز اختیار کرتا ہے۔

۵ صوفی مذاہب و عقیدہ کی بنیاد پر قومیت استوار کرنے کے خلاف ہے ۔ اور مذاہب کے موجودہ تعصبات کو درست نہیں سمجھتا ۔ وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا حامی ہے ۔

سو یہ ہیں تصوّف اور اہلِ تصوّف کے وہ اصول و عقائد جو کشمکش کے موجودہ پُر آشوب دور میں کل بنیٔ نوعِ انسان کے لیے اتحاد، امن اور ترقی کا پیغام رکھتے ہیں، اور دنیا کے جملہ انسانیت دوستوں کو دعوتِ فکر و عمل دیتے ہیں ۔ مجھے امید ہے کہ تشدّد و منافرت اور استحصال و مفاد پرستی کے مزید تباہ کن تجربات کرنے سے پہلے ۔ یا بعد میں ۔۔ دنیا کو کسی نہ کسی نام سے انھیں اصول و عقائد کو اپنانا پڑے گا ۔ ممکن ہے بعض افراد یا گروہ میری ان بروقت معروضات کو غلط معنی پہنائیں اور نفرت و تعصب کے جوش میں انھیں حقارت سے ٹھکرادیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ ۔ جلد یا بدیر ۔ انھیں اس طرف متوجہ ہونا ہی پڑے گا ۔ کیونکہ بقول شخصے ؎

آنچہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

۔ ۞ ۔